قرطبہ کی خاموش اذانیں

اے حمید

غالب پبلشرز

پیش کش : ملت ڈاٹ کام

www.millat.com

عرضِ ناشر

اے حمید کا نام مہماتی ناول نگاری اور سفر نامہ نگاری کی دنیا میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ اگر ادبی دنیا مُن مہماتی، رومانوی اور تحیر خیز ناولوں اور افسانوں میں آپ کے نام کا ڈنکا بجتا ہے اور آپ کو بلا مبالغہ ادبی دنیا کا بے تاج بادشاہ قرار دیا جا سکتا ہے تو دوسری طرف آپ بچوں میں بھی بے حد مقبول ہیں۔ آپ بچوں کے لیے بے شمار کہانیوں کی کتب لکھ چکے ہیں۔ اور حال ہی میں پی ٹی وی سے عینک والا جن کی وساطت سے آپ پاکستان بھر کے بچوں کے ہر دلعزیز مصنف بن چکے ہیں یہ پروگرام لکھ کر آپ نے بلاشبہ بچوں کے لئے این بین الاقوامی معیاری کی تفریح پیش کی ہے۔ اب ہم بھی بین الاقوامی میڈیا کی مارکیٹ میں فن ہاؤس اور اس طرح کے دیگر بے شمار پروگراموں کے درمیاں بلا تامل اپنا ''عینک والا جن'' پیش کر سکتے ہیں۔

آپ بے شمار ممالک کے سفر کر چکے ہیں' اور یہ سفر' ننگے پاؤں' ننگے بدن' خالی جیب' کے ساتھ کئے گئے۔ یہ سفر نامہ دیگر سفر ناموں کی طرح نہ تو معلومات کا انبار لئے ہوئے ہے' اور نہ ہی اس میں نرا پند و نصائح کا وعظ ہے۔ اس میں بلا مقصد تفریح بھی نہیں ہے۔

بلکہ یہ سفر نامہ تو ایک عام مسلمان ادیب کے دل سے نکلے ہوئے جذبات کا ایک فطری' والہانہ اور سچا اظہار ہے۔ اس میں ہمیں اگر رومانس کی اٹکھیلیاں ملتی ہیں تو سسپنس اور ایڈونچر بھی اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔ یہ جگہ جگہ روایتی انسانووی انداز بھی لئے ہوئے ہے اور مسلمانوں کی عظیم الشان اور شاندار مگر گمنام باب کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔

غالب پبلیشرز کی یہ پیشکش بالخصوص پاکستان کی اس نوجوان نسل کے لئے ہے جس نے قیامِ پاکستان کے بہت بعد آنکھ کھولی' جسے تاریخ کے مطالعہ کا شوق نہیں ڈالا گیا' جو اپنے دین و لت اور ملک و وطن کی خاطر بہت کچھ کر گذرنا چاہتی ہے مگر اسے اپنی تاریخ کے متعلق مکمل معلومات ہی حاصل نہیں ہیں' وہ کرتے کیا کرے۔۔۔۔۔! زیرِ نظر کتاب بلاشبہ ہماری نوجوان نسل میں نہایت دلچسپ انداز میں اپنی گم شدہ تاریخ کے مطالعہ کا شوق پیدا کرتی ہے اور اس میں دیگر ممالک کے سفر کے دوران پیش آمدہ تکالیف و پریشانیوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے تاکہ سیاحت کے میدان میں نو واردوں کو ان مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے جو دیارِ غیر میں قدم قدم پر موجود ہوتی ہیں۔ اب میں آپ اور مصنف کے درمیان زیادہ دیر حائل نہیں ہونا چاہتا۔ لیجئے کتاب' سوری بلکہ ناول نما سفر نامہ کا مطالعہ کیجئے.....!

محمد سیف الاسلام

یکم مارچ ۱۹۹۶ء

لاہور۔

سپین کے جنوب میں ملاغہ کی سمندری چٹانوں سے نکل کر جب ہم سرو کے درختوں، کھجور، انگور اور سنگتروں کے باغوں والی سرسبز شاداب پہاڑی وادی میں داخل ہوتے ہیں تو غرناطہ کی طرف جانے والی نیم پہاڑی سڑک کی بائیں جانب کھجوروں کے چھوٹے سے جھنڈ میں ایک قبر ہے۔ اس قبر میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ اس پر کوئی کتبہ نہیں لگا ہوا ہے۔ تعویذ کا پتھر جگہ جگہ سے ٹوٹا ہوا ہے۔ قبر کے اوپر سرخ انگوروں کی بیل کی چھت کسی نے ڈال دی ہے۔ خزاں کے موسم میں انگور کے خشک پتے اپنی شاخوں سے ٹوٹ کر گرتے رہتے ہیں۔ ہوا چلتی ہے تو یہ خشک پتے آہیں بھرتے قبر کے آس پاس اڑتے رہتے ہیں۔ مراکش کے ساحلی شہر سیوتہ سے جو مسلمان سیاح اس وادی میں داخل ہوتے ہیں، وہ غرناطہ کی طرف جاتے ہوئے یہاں رک کر فاتحہ ضرور پڑھتے ہیں۔

اس قبر کے بارے میں ایک روایت مشہور ہے کہ یہاں سپین کا آخری مور مسلمان دفن ہے۔ سقط ہسپانیہ کے بعد جب غرناطہ بھی مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا تو ہسپانیہ کا آخری مسلمان تاجدار ارباب عادل اپنی ملکہ سلطانہ عائشہ، اپنے اہلِ خاندان اور بچے کھچے امراء کے ہمراہ اس وادی میں پہنچا۔ سامنے آبنائے جبرالٹر تھی جس کے دوسری جانب شمالی افریقہ کا ملک مراکش تھا۔ کہتے ہیں کہ یاں ایک ٹیلے کی چوٹی پر کھڑے ہوئے بادشاہ باب عادل نے اندلس کی وادیوں اور سرو کے اونچے درختوں میں سے نظر آنے والے مقبروں کے گنبدوں اور مسجدوں کے چوکر میناروں پر آخری نگاہ ڈالی تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ تب ملکہ سلطانہ عائشہ نے کہا:

''جس سلطنت کی تم مردوں کی طرح حفاظت نہیں کر سکے، اس سلطنت کی محرومی پر عورتوں

کی طرح آنسو کیوں بہاتے ہو؟''

ملکہ عائشہ سلطانہ نے یہ جملہ کہا ہو یا نہ کہا ہو۔ مگر تاریخ نے اسے ریکارڈ کر لیا ہے۔ یہ جملہ سپین میں مسلمانوں کے آٹھ سو سالہ اقتدار کے آخری دور کی نسل چپقلش' سیاسی سازشوں اور باہمی نفاق پر ایک گہرا طنز ہے۔

ملاغہ کے انگوروں کے باغوں اور کھجوروں کے اونچے اونچے درختوں سے لدی ہوئی سرسبز و شاداب وادی سے گذرتا ہوا یہ شکست خوردہ شاہی قافلہ جب جنوبی سپین کی آبنائے جبرالٹر کی طرف روانہ ہوا تا کہ وہاں سے سمندر عبور کر کے شمالی افریقہ میں داخل ہو تو راستے میں قافلے کا ایک مسلمان سردار فوت ہو گیا۔ اسے وہیں ایک طرف درختوں کے سائے میں دفن کر دیا گیا۔ اس کی قبر ہسپانیہ میں شمالی افریقہ کی طرف فرار ہوتے مسلمانوں کے زوال کی آخری نشانی بن گئی ۔ یہ قبر آج بھی سڑک کنارے کھجوروں کے باغ میں شکستہ حالت میں موجود ہے۔ ہسپانیہ پر عیسائیوں کا قبضہ ہو گیا۔ ہسپانیہ میں ایک بھی مسلمان باقی نہ رہا۔ مگر یہ ٹوٹی پھوٹی قبر مسلمانوں کی عظمت رفتہ کی خاموش داستان سنانے کے لئے باقی ہے۔

میں سپین میں اپنی سیاحت شروع کرنے سے پہلے اس قبر کے بارے میں جو روایت مشہور ہے' وہ سن رکھ تھی اور دل میں عہد کر لیا تھا کہ اس قبر پر فاتحہ پڑھنے کے بعد سپین میں اپنی سیاحت کا آغاز کروں گا۔ یہ روایت مجھے شمالی مراکش کے شہر طیطون کے ایک قہوہ خانے میں مجھے ایک مسلمان مور نے سنائی تھی۔ میں نے اسلام آباد میں سپین کے سفارت خانے سے اپنے پاسپورٹ پر سپین کا تین مہینے کا ٹورسٹ ویزا لگوا لیا تھا۔ حسب روایت میرے مالی وسائل محدود تھے اور میرے پاس اتنی ہی ہسپانوی کرنسی تھی جتنی کرنسی ساتھ لے جانے کے لیے ایک سیاح کو اجازت ہوتی ہے۔ ظاہر ہے یہ رقم بہت تھوڑی ہوتی ہے اور کسی بھی ملک کے تین ماہ کے

اخرابات پورے نہیں کرسکتی۔ لیکن میرا شوق سفر مجھ سے دو قدم آگے تھا۔ خاص طور پر سپین کی سیاحت میرا ایک دیرینہ خواب تھا جو اب پورا ہونے والا تھا۔ میں نے یہی سوچ رکھا تھا کہ کھیتوں میں، ریستورانوں میں، گیس اسٹیشنوں پر جہاں کہیں کام ملے گا، راستے میں کام بھی کروں گا اور سیاحت بھی جاری رکھوں گا۔ ماڈرن سپین کے بارے میں، میں نے ضرورت کے مطابق کافی معلومات حاصل کر رکھی تھیں۔

سپین کے آخری مسلمان کی قبر پر فاتحہ پڑھ کر اپنی سیاحت شروع کرنیکے خیال سے میں مراکش کی طرف سے ہسپانیہ میں داخل ہونا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے پاسپورٹ پر مراکش کا ویزا بھی لگوالیا تھا۔ مراکش کا ملک میں اس لئے بھی دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ ملک ہسپانیہ کے اسلامی کلچر اور ثقافت کا سرچشمہ ہے۔ جلاوطن عباسی شہزادوں نے اسی ملک میں آکر مور مسلمانوں کی ایک فوج بنائی تھی اور پھر اسپین میں داخل ہوئے تھے۔ میں نے آبنائے جبرالٹر ایک سٹیمر میں بیٹھ کر عبور کی اور سپین کی سرزمین میں داخل ہوگیا۔ بارڈر پر چیک پوسٹ کی عمارت کے برآمدے میں دوسرے ملکوں کے سیاح بھی موجود تھے۔ کاغذات چیک کئے جارہے تھے۔ بہار کے موسم کی خنگ ہوا چل رہی تھی۔ کسٹم کی عمارت کے پس منظر میں صنوبر اور سرو کے درختوں اوپر سپین کا نیلا شفاف اسمان دن کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ میں نے گہرا سانس لیا۔ ہوا میں مجھے اسپین کے انگوروں اور سنگتروں اور الحمرا کے باغوں میں کھلنے والے سیاہ گلابوں کی خوشبو محسوس ہوئی۔ ہوسکتا ہے کسٹم کی چوکی کے آس پاس یہ خوشبو نہ ہو مگر میں نے یہ خوشبو ضرور محسوس کی تھی۔ برآمدے میں پلاستک کی سرخ کرسیاں پڑی تھیں۔ محرابوں کے سائے میں لکڑی کے کچھ بنچ بھی رکھے ہوئے تھے جن پر سیاح مرد اور عورتیں اور دوسرے مسافر اپنے بال بچوں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ ان میں افریقی لوگ بھی تھے۔ میں قطار میں کھڑے کھڑے بور ہوگیا۔ قریب ہی برآمدے کے ستون

کے پاس نیچے گھاس پر دو کرسیاں خالی تھیں۔ میں ایک کرسی پر بیٹھ کر سگریٹ پینے لگا۔

اتنے میں ایک گہرے سانوے رنگ کا دبلا پتلا لڑکا جس کی عمر بیس بائیس برس ہوگی، میرے قریب والی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے بھورے رنگ کا انگریزی سوٹ پہن رکھا تھا۔ آنکھوں پر نظر کا چشمہ لگا تھا۔ شکل صورت سے وہ کوئی دانشور ٹائپ کا لڑکا لگتا تھا۔ اس نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر ایک سگریٹ منہ میں دبایا اور کوٹ کی جیبوں میں ماچس تلاش کرنے لگا۔ میں نے ماچس کی تیلی جلا کر آگے کر دی۔ اس نے سگریٹ منہ سے نکالا۔ میری طرف مسکرا کر دیکھا اور سگریٹ جلا کر میرا انگریزی میں شکریہ ادا کیا۔ شکل صورت ہی سے لگ رہا تھا کہ وہ کسی افریقی ملک کے رہنے ولا ہے۔ مگر رنگ چونکہ زیادہ کالا نہیں تھا، اس لئے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ شمالی افریقہ کے کسی ملک کا باشندہ ہے۔

محض بات کرنے کی خاطر میں نے آسمان کی طرف دیکھ کر انگریزی میں کہا:

''سپین میں بہار کا موسم خوشگوار ہوتا ہے۔''

لڑکے نے چشمہ اتارا۔ اس کے شیشے ٹشو پیپر سے صاف کرتے ہوئے انگریزی میں ہی کہا:

''شماں میں اس موسم میں بھی سردی ہوتی ہے اور بارشیں بھی ہوتی ہیں۔''

میں نے کہا:

''شمالی سپین تو فرانس کے بارڈر سے جا ملتا ہے نا؟''

''یس۔ وہاں سردی ہوتی ہے مگر سپین شمالی شہر فرانس کی سرحد سے کافی پیچھے ہے، اس لئے بہار میں وہاں زیادہ سردی نہیں پڑتی۔ بارسلونا میں تو گرمی ہوتی ہے۔''

میں نے اس کی باتوں سے محسوس کیا کہ سپین کے بارے میں وہ کافی معلومات رکھتا ہے۔

میں نے اس سے پوچھا:

''تم مراکش کے رہنے والے ہو کیا؟''

وہ شرمیلی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا:

''ہاں۔ میں مراکو میں یونیورسٹی کا سٹوڈنٹ ہوں۔ سپین کی ہسٹری میرا سبجیکٹ ہے۔ کالج میں چھٹیاں تھیں۔ میں نے سوچا کیوں نہ سپین کا ایک چکر لگا آؤں۔''

پھر اس نے مجھ سے میرے بارے میں پوچھا تو میں نے اسے اپنا اسلامی نام اور وطن پاکستان بتایا۔ وہ پاکستان کا نام سن کر بڑا خوش ہوا۔ اس نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا کر مجھ سے گرمجوشی کے ساتھ مصافحہ کیا۔

''میرا نام سباطی ہے۔ تم سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ میں پاکستان کبھی نہیں گیا۔ مگر میں نے پاکستان کی پوری ہسٹری پڑھی ہے۔ قائدِ اعظمؒ سے مجھے بڑی عقیدت ہے۔ وہ مسلمانوں کے سچے اور بلند کردار لیڈر تھے۔ کیا تم پہلی بار سپین آئے ہو؟''

میں نے کہا:

''ہاں۔ سپین میں یہ میرا پہلا سفر ہے۔ میں اس ملک کے جنگل، وادیاں، دریا، مسجد قرطبہ، الحمراء اور کھجوروں کے باغات دیکھنا چاہتا تھا۔ جہاں مسلمانوں نے آٹھ سو سال حکومت کی اور سائنس، طب، طبیعات، کیمیا، فلسفہ اور منطق پر گراں قدر کام کیا۔ میرا یہ شوق ہی مجھے سپین لے آیا ہے۔''

سباطی کی آنکھوں میں چمک سی آ گئی۔ کہنے لگا:

''سپین کے مسلم دور کی تاریخ میرا سبجیکٹ ہے، ہماری مائیں ہمیں جو لوریاں دیتی ہیں، ان میں اندلس کے مسلمان بادشاہوں اور الحمراء باغات کا ذکر ہوتا ہے، یہ سب کچھ ہمارے خون میں رچ بس گیا ہے۔''

میں دل میں خوش ہوا کے مجھے ایک دانش ور قسم کے مسلمان نوجوان کا ساتھ مل گیا ہے۔ جو

سپین کی تاریخ کے علاوہ یہاں کے شہروں سے بھی واقف تھا۔ سباطی نے مجھے بتایا کہ وہ ہر سال سپین آتا ہے۔ وہ سپین کو کونا کونا پھر چکا ہے۔ خاص طور پر قرطبہ اور غرناطہ کے گلی کوچوں کے نام تک سے یاد ہیں۔ میں نے اس سے پوچھا کی کیا وہ سپینی زبان بول لیتا ہے؟

''کیوں نہیں؟'' سباطی نے جواب دیا۔ ''میں سپینی زبان اپنی مادری زبان عربی کی طرح بول لیتا ہوں۔ میری والدہ کا خاندان عباسی دور میں عرب شہزادوں کے ساتھ ہی یہاں جلاوطن ہو کر آ گیا تھا۔ اس اعتبار سے میں عرب مور ہوں۔''

میں نے ایک بار پھر سباطی سے مصافحہ کیا اور کہا:

''تم سے مل کر مجھے مزید خوشی ہوئی ہے۔''

کسٹم والوں کے آفس کے باہر جو قطار لگی تھی' وہ دروازے کے قریب پہنچ گئی تھی۔ سباطی نے سگریٹ پھینک کر کہا:

''جیبی! اب ہمیں وہاں پہنچنا چاہیے۔''

کسٹم آفیسر ایک ایک کر کے آدمیوں کو بلاتا تھا۔ میری باری آئی تو اس نے اپنی کرنجی آنکھوں سے مجھے گھور کر دیکھا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ میرا پاسپورٹ اس کے سامنے کھلا پڑا تھا اور اس کو معلوم ہو گیا تھا کہ میں پاکستانی ہوں۔ کسٹم آفیسر کا رنگ یورپ کے لوگوں کی طرح گورا تھا مگر سر کے بال اور آنکھیں سیاہ تھیں۔ یہ اندلس میں عرب مسلمانوں کے آٹھ سو سالہ قیام کا اثر تھا۔ اس نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں پوچھا:

''تمہارے پاس حشیش تو نہیں ہے؟ اگر ہے تو مجھے بتا دو۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا اور کہا:

''سر! میرے ٹورسٹ بیگ میں یہ کچھ ہے، جو آپ دیکھ چکے ہیں۔ میں حشیش وغیرہ سمگل کرنا گناہ سمجھتا ہوں۔''

وہ میرے پاسپورٹ کے ورق الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔ آدمی نوجوان تھا اور ہلکے نیلے سوٹ میں تھا۔ میری طرف دیکھے بغیر بولا:

''ہمیں پاکستانیوں کے بارے میں خاص طور پر ہوشیار رہنے کے لئے کہا گیا ہے۔ تم ہمارے ملک میں کیا دیکھنے آئے ہو؟''

میں نے کہا:

''میں صرف سیاحت کرنے آیا ہوں جس طرح دوسرے سیاح آتے ہیں۔''

اس نے گھور کر مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں نفرت کی بجلیاں سی چمک رہی تھیں۔

''تم غلط کہتے ہو۔ تم مسلمان اپنے بادشاہوں کے محل، ان کی بنائی ہوئی مسجدیں دیکھنے آتے ہو۔ مگر اب وہ محل ہمارے قبضے میں ہیں اور ہم نے تمہاری مسجدوں کو گرجاؤں میں تبدیل کر دیا ہے۔''

مجھے غصہ تو بہت آیا۔ مگر مصلحت کا تقاضا یہی تھا کہ میں خاموش رہوں۔ ورنہ وہ مجھے وہیں سے مراکش روانہ کر دیتا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے اتنے زور سے میرے پاسپورٹ پر انٹری کا ٹھپہ لگایا کہ میز پر پڑی دوسری چیزیں کانپ گئیں۔ میرے بعد میرا مراکشی ہم سفر طالبِ علم سباطی اندر داخل ہو گیا۔ جب وہ باہر نکلا تو مسکرا رہا تھا۔ میں نے اسے کسٹم آفیسر کے نفرت انگیز رویے کے متعلق بتایا تو سباطی ہنس کر بولا:

''میں نے اس کی طبیعت ٹھیک کر دی ہے، یہ نصرانی کسی مسلمان کے وجود کو اپنی سرزمین پر برداشت نہیں کر سکتے۔ اپنی سرزمین پر کسی مسلمان کو دیکھ کر انہیں یاد آ جاتا ہے کہ ان لوگوں نے

ہم پر آٹھ سو سال حکومت کی ہے اور ہماری سیاہ آنکھیں، سیاہ بال اور زبان و ثقافت آج بھی ان مسلمانوں کی مرہونِ منت ہے۔"

یہاں سے میری ہسپانیہ کی سیاحت شروع ہو رہی تھی۔ میں نے سباطی سے پوچھا کہ اس کا ارادہ کس شہر کی طرف جانے کا ہے۔ اس نے کہا:

"میں یہاں سے ملاغہ جاؤں گا۔ وہاں سے غرناطہ اور پھر قرطبہ کی طرف نکل جاؤں گا۔ شروع ہی سی میرا یہ روٹ رہا ہے۔"

سباطی کی شکل میں مجھے گائیڈ بھی مل گیا تھا۔ اگرچہ میں نے ہمیشہ گائیڈ کے بغیر سفر کرنے کو ترجیح دی ہے مگر سپین ایک ایسا ملک تھا جہاں قدم قدم پر مسلمانوں کی عظمتوں کے نشان بکھرے ہوئے تھے۔ چنانچہ میں ان کے بارے میں پوری معلومات بھی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اور اس کے واسطے سباطی ایک بہترین گائیڈ تھا۔ میں نے کہا:

"ٹھیک ہے۔ میں بھی قرطبہ کے لیے یہی روٹ اختیار کروں گا۔

اس طرح ہمارا آپس میں ساتھ بھی رہے گا۔"

کسٹم آفس سے ہم ایک بس میں سوار ہو کر ملاغہ کی سمت روانہ ہو گئے۔ بس میں دوسرے ممالک کے سیاح بھی سوار تھے۔ قسم قسم کی زبانیں بولی جا رہی تھیں۔ ایک عرب تاجر بھی ہامری قریبی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ سباطی اس سے عربی میں گفتگو کرنے لگا۔ میں کھڑکی میں سے باہر دیکھ رہا تھا۔ بس نیم پہاڑی علاقے میں سے گذر رہی تھی۔ انگور کا ایک باغ گذر گیا۔ وہاں سپینی مرد اور عورتیں کام کر رہی تھیں۔ سرخ انگوروں سے بھرے ہوئے ٹوکرے ایک ٹرک میں ڈالے جا رہے تھے۔ عورتوں نے سروں پر سرخ اور سیاہ پھولدار رومان باندھ رکھے تھے۔ جوار کے کھیتوں کے کنارے کنارے سرو اور کھجور کے درخت نظر آ جاتے تھے۔ کھجور کے یہ درخت

مسلمان عرب اپنے ساتھ لائے تھے۔ عبدالرحمان اول نے سپین میں کھجور کا پہلا پودا لگایا تھا۔
مجھے علامہ اقبالؒ نظم یاد آرہی تھی۔ ع۔۔۔۔

میری آنکھوں کا نور ہے تو

اس سرزمین پر علامہ اقبالؒ نے مسلمانوں کی عظمت رفتہ کو یاد کر کے آنسو بہائے تھے۔ بس ایک کھنڈر کے قریب سے گذری۔ کھنڈر کی صرف ایک محرابی دیوار ہی باقی تھی۔ خدا جانے یہ کس ایوان گم شدہ کی نشانی ہے۔ راستے میں ایک ٹیلے ڈھلان پر سفید دیواروں اور جھکے ہوئے چھجوں والے مکان نیچے تک پھیلے ہوئے تھے۔ سباطی نے ان مکانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

''یہ القیر ات کا قصبہ ہے۔ یہ قصبہ مور مسلمانوں کی آخری یادگار ہے۔ سپین میں جب مسلمانوں کی سلطنت صرف غرناطہ میں سمٹ کر رہ گئی تھی تو رالقریات ایک معمولی سا گوں تھا۔ عرب یہاں آکر آباد ہوئے اور انہوں نے قصبے کو مختلف صنعتی شعبوں میں بڑی ترقی دی۔ اس قصبے کی ہاتھ سے بنی ہوئی چادریں آج بھی سپین میں بڑی مشہور ہیں۔''

کہاں ایک ریستوران میں ہم نے دوپہر کا کھانا کھایا۔ بس یہاں سے آگے روانہ ہوگئی۔ راستے میں کئی چھوٹے چھوٹے ندی نالے آئے۔ ایک دریا بھی آیا جس کا پاٹ بڑی نہر جتنا تھا۔ اس کے کنارے کنارے دور تک سرو کے درختوں کی قطاریں تھیں۔ شام کے سائے گہرے ہورہے تھے جب سیاحوں کی یہ بس ملاغہ کے پہاڑی مضافات میں داخل ہوئی۔ آس پاس اونچے نیچے ٹیلوں پر مکانوں کی گیلریوں میں پھولوں کے گملے نظر آرہے تھے۔ کئی مکانوں کی دیواروں پر پھلدار بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ ہوا میں ایک عجیب طرح کی ہلکی ہلکی سبزے اور پھولوں کی مہک بسی ہوئی تھی۔ یہ ساحل سمندر کا پہاڑی علاقہ تھا۔ ہماری بائیں جانب چٹانوں کا سلسلہ تھا۔ دائیں طرف مکانات تھے جو سب کے سب سفید تھ۔ ایک سرخ فراک والی موٹی

عورت بالکونی میں جھکی نیچے بازار میں کچھ دیکھ رہی تھی۔

ملاغہ کے رستورانوں کے باہر شام کے وقت لوگ کرسیوں پر میزوں کے گرد بیٹھے قہوے اور مقامی سرخ وائن سے جی بہلا رہے تھے اور تیز تیز لہجے میں سپینی زبان میں باتیں بھی کر رہے تھے۔ بس اونچی چھت والے گیراج کے اندر آ کر رک گئی۔ میں اور سباطی ایک ریستوران کے باہر آ کر بیٹھ گئے۔ ہم نے قہوہ منگایا اور پینے لگے۔ سباطی مجھ سے کہا:

''یہاں رات بسر کرنے کے لیے ہمیں سرائے نما ہوٹل میں ایک بستر مل جائے گا۔ تھوڑے سے پیسوں میں رات بسر ہو جائے گی۔''

میں نے سڑک کے پار چھوٹے سے پارک میں جلتی ہوئی روشنیوں کی طرف دیکھ کر کہا:

''میں ہسپانیہ میں اپنی پہلی رات تاروں بھرے آسمان کے تلے بسر کرنا چاہتا ہوں۔''

سباطی مسکرایا:

''رات کو اتنی سردی ہو جائے گی کہ صبح تک ٹھٹھر کر مر جاؤ گے۔''

پھر جیسے اسے کوئی خیال آ گیا۔ میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولا:

''کیا خیال ہے اگر رات ایک پر آسائش حویلی میں بسر کی جائے؟''

میں نے قہوے کی پیالی میز پر رکھتے ہوئے کہا:

''اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔''

سباطی کہنے لگا:

''یہاں ملاغہ میں کیمسٹری کا ایک ریٹائرڈ پروفیسر اپنی آبائی حویلی میں رہ رہا ہے۔ وہ میرے والد کا دوست ہے۔ سپین کی سیاحت کے دوران میں وہ ایک بار ان کے ہاں ٹھہرا ہوں۔ اگر تم پسند کرو تو ہم اس کے ہاں چلتے ہیں، اس کا نام پونیتارو ہے۔''

میں خود چاہتا تھا کہ کسی کے گھر میں قیام کروں تا کہ مجھے وہاں کی ثقافتی اور گھریلو زندگی کے بارے میں معلومات حاصل ہوں۔ میں نے فوراً حامی بھر دی۔ سباطی نے کرسی چھوڑتے ہوئے کہا:

''تو پھر اٹھو۔ پروفیسر پونیتارو کے گھر چلتے ہیں۔''

پروفیسر کی آبائی حویلی شہر سے باہر واقع تھی۔ جب ہم وہاں پہنچے تو رات ہو چکی تھی۔ حویلی کا محرابی دروازہ کھلا تھا۔ محراب کے درمیان ایک بلب روشن تھا۔

آدھی محراب کسی پھلدار بیل سے ڈھکی ہوئی تھی۔ ان پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ سباطی نے دیوار کے ساتھ لگا بٹن دبایا۔ اندر گھنٹی بجنے کی دھیمی سی آواز آئی۔ تھوڑی دیر میں ایک ہسپانوی ملازم باہر آ گیا۔ سباطی کو دیکھ کر وہ مسکرایا اور ہسپانی زبان میں اسے کچھ کہا۔ سباطی نے بھی ہسپانی زبان میں کوئی بات کی اور پھر مجھے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ حویلی کی ڈیوڑھی میں سے گذرے تو آگے ایک چھوٹا سا صحن آ گیا۔ جس کے وسط میں فوارہ لگا ہوا تھا۔ فوارہ چل نہیں رہا تھا۔ سامنے برآمدہ تھا جس کے ستون محراب دار تھے۔ ان ستونوں پر بھی پھولدار بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ ملازم نے ہمیں برآمدے میں رکھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھنے کے لئے کہا اور خود اندر چلا گیا۔ برآمدے میں بھی بلب روشن تھا۔ ایک پرسکون سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس خاموشی میں حویلی کے کسی کمرے سے انگریزی میوزک کی ہلکی ہلکی آواز بڑی صاف سنائی دے رہی تھی۔ تھوڑا غور کرنے پر محسوس ہوا کہ یہ ہپنی میوزک تھا اور اس کی ردھم بڑی فاسٹ تھی۔ کسی نے کیسٹ پلیئر لگایا ہوا تھا یا ریڈیو پر میوزک کا پروگرام ہو رہا تھا۔ اتنے میں دروازہ کھلا اور ایک چوڑی پیشانی والا ادھیڑ عمر آدمی مسکراتا ہوا باہر نکل کر سباطی کی طرف بڑھا اور ہسپانی زبان میں بڑے خندہ پیشانی سے سباطی سے مصافحہ کرنے کے بعد اس سے باتیں کرنے لگا۔ سباطی نے

میرا تعارف کرایا۔ یہ پروفیسر پونیتارو تھا' اس کا سر گنجا تھا۔ باقی کے بالوں میں آدھے سے زیادہ بال سفید تھے۔ قد چھوٹا اور جسم گٹھا ہوا تھا۔ وہ جیکٹ اور سیاہ پتلون میں تھا۔

پروفیسر نے ہمیں اندر ایک کمرے میں لے جا کر بٹھایا۔ کمرے میں فرش پر پرانا قالین بچھا ہوا تھا۔ سرخ رنگ کا صوفہ سیٹ تھا۔ دیواروں پر حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریمؑ تصویروں کے علاوہ کسی بل فائیٹر کی قد آدم تصویر بھی لگی تھی جس میں وہ سرخ کپڑا لمبی تلوار پر پھیلائے ایک بھینسے سے مقابلہ کرتے دکھایا گیا تھا۔

پروفیسر نے ہمارے لئے چائے منگوائی اور سباطی سے باتیں کرنے لگا۔ جب اسے پتہ چلا کہ میں پاکستان سے آیا ہوں اور سپینی زبان نہیں جانتا تو اس نے انگریزی میں بولنا شروع کیا۔ میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا:

''پاکستان میں تمہارا ایک شہر لاہور ہے۔ میں نے اس شہر کی بڑی تعریف سنی ہے۔ میں نے اخبار میں پڑھا تھا کہ وہاں ایک چوک کا نام قرطبہ چوک رکھا گیا ہے۔''

میں نے اسے بتایا کہ اس چوک کی نقاب کشائی سپین کے قونصل جنرل نے کی تھی اور ہم نے مسجدِ قرطبہ کے نمونے پر وہاں ایک مسجد بنائی ہے اور کھجور کے دو درخت بھی لگائے ہیں۔

پروفیسر پونیتارو بڑی خوش اخلاقی سے مسکرا رہا تھا۔ کہنے لگا:

''اچھی بات ہے۔ مجھے معلوم' ہے تم لوگ بڑے مذہبی ہو۔ یہ بھی اچھی بات ہے۔ آدمی کو اپنے مذہب سے محبت کرنی چاہیے۔ کبھی اس بحث میں نہیں پڑنا چاہئے کہ کونسا مذہب اچھا ہے۔ سبھی مذاہب اچھے ہیں اور آدمی کے لئے وہی مذہب سب سے بہتر ہوتا ہے جس مذہب میں وہ پیدا ہوا ہے۔ ویسے تم پاکستانی ایک بہادر قوم بھی ہو۔ مجھے تم سے مل کر بڑی خوشی ہوئی ہے۔''

پھر وہ سباطی سے مخاطب ہو کر بولا:

''سباطی! اتفاق سے میری بہو بھی میڈرڈ سے آئی ہوئی ہے۔ وہ آج کل میڈرڈ یونیورسٹی میں میوزک کی پروفیسر ہے۔ تم تو اسے مل چکے ہو۔''

''کیوں نہیں، ڈونا بلانشے سے تو میں دوبار اسی مکان میں مل چکا ہوں، کیا وہ اس وقت گھر پر ہی ہے؟''

''وہ گروہ سری لینے سٹور تک گئی ہے۔ آتی ہی ہوگی۔''

اسی وقت ملازم لڑکا قہوہ لے کر آ گیا۔ منقش طشت میں تین پیالیاں اور قہوے کی ایک چینگ رکھی تھی۔ ساتھ کچھ بسکٹ بھی تھے۔ پروفیسر نے پائپ سلگا لیا۔ کمرے میں تمباکو کی خوشبو پھیل گئی۔ وہ پیالیوں میں قہوہ انڈیلنے لگا:

''سباطی! ہمارا دوست اور تمہارا باپ کیسا ہے؟''

سباطی نے کہا:

''ڈیڈی بالکل ٹھیک ہیں۔ کبھی کبھی آپ کی بڑی مزے دار باتیں سنایا کرتے ہیں۔''

پروفیسر نے دل کھول کر قہقہہ لگایا:

''ارے وہ ہمارا پرانا یار ہے۔ ہم نے کیسا بلانکا میں بڑا خوب صورت وقت گذرا ہے۔ اسے کہنا کبھی کبھی ملنے آ جایا کرے۔ تم تو جانتے بیوی کی موت کے بعد میں یہاں بالکل اکیلا رہ گیا ہوں۔ ایک ہی بیٹا ہے جو میڈرڈ میں رہتا ہے۔ بہو اکیلی ہی آئی ہے۔ بیٹا نہیں آیا۔''

پھر آہ بھر کر بولا:

''اولاد جوان ہو جائے تو پھر اسے مجبور نہیں کیا جا سکتا۔''

تھوڑی دیر بعد باہر کار کے رکنے کی آواز آئی۔ پروفیسر نے ہونٹوں سے پائپ ہٹاتے ہوئے خوش ہو کر کہا:

''بہو آ گئی ہے۔''

پروفیسر کی بہو جس کا نام بلانشے تھا' ایک صحت مند بھرپور عورت تھی۔ سیاہ بال تھے۔ مانگ ہسپانوی دوشیزاؤں کی طرح درمیاں سے نکلی ہوئی تھی۔ پھولدار فراک کے ساتھ سیاہ شلوکا پہنا ہوا تھا۔ کندھوں پر سرخ رنگ کی شال تھی۔ سباطی کی طرف دیکھ کر مسکرائی اور سپینی زبان میں کچھ کہا اور اس سے ہاتھ ملایا۔ اس نے مجھ سے بھی ہاتھ ملایا۔ سباطی نے میرا تعارف کراتے ہوئے انگریزی میں کہا:

''یہ میرا دوست پاکستان سے سپین کی سیاحت کے لیے آیا ہے۔'' ڈونا بلانشے کا ہاتھ گرم تھا۔ اس کی سیاہ آنکھیں بجلی کی روشنی میں برنٹوں کی طرح چمک رہی تھیں۔

''سینور! تم سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔''

پھر اس نے سباطی سے کہا:

''میں تمہارے لئے کھان تیار کرواتی ہوں۔''

پروفیسر نے ہنس کر کہا:

''سباطی رات بھی یہیں رہے گا۔ اس کے لئے صبح ملاغہ کی پامفرے مچھلی کا ناشتہ بھی تیار کرنا ہوگا۔''

سباطی نے شرماتے ہوئے کہا:

''نہیں انکل! اس کی ضرورت نہیں ہے۔''

پروفیسر نے سباطی کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے خوش دلی سے کہا:

''سباطی! تم میرے پیارے دوست کے بیٹے ہو۔ اور مجھے اپنے بیٹے کی طرح عزیز ہو۔''

رات کے کھانے کی میز پر دو تین ڈشیں تیار کی گئی تھیں۔ پروفیسر کی بہو ڈونا بلانشے نے اپنی

نگرانی میں بڑا لذیز کھانا تیار کروایا تھا۔ کھانے کا کمرہ چھوٹا سا تھا۔ اس کے چاروں کونوں میں لکڑی کے سٹینڈر رکھے ہوئے تھے۔ جن پر پھولدار گملے رکھے تھے۔ کھانے کی میز کے وسط میں بھی گلدان پڑا تھا جس میں موسم کے پھول بہار دے رہے تھے۔ سپین کے لوگوں کو پھولوں کا بے حد شوق ہے اور پھولوں اور خوشبوؤں کا یہ شوق انہیں عرب مسلمانوں کی طرف سے تحفتاً وراثت میں ملا ہے۔

کھانے کے بعد کافی کا دور چلا۔ کافی تیز اور کڑوی تھی، مگر مجھے بڑی اچھی لگی۔ کافی پینے کے بعد ہم لوگ بڑے کمرے میں آ گئے۔ رات کو سردی ہو گئی تھی۔ پروفیسر نے آتش دان میں لگا ہوا بجلی کا ہیٹر آن کر دیا جس سے کمرے کی فضاء تھوڑی ہی دیر میں بڑی خوشگوار ہو گئی۔ ڈونا بلانشے نے میوزک پر باتیں شروع کر دیں۔ پروفیسر نے پائپ سلگانے کے بعد کہا:

''مائی ڈیئر! میوزک پر صرف باتیں کرنا اچھا نہیں لگتا۔''

بلانشے مسکرائی۔ پھر وہ اٹھ کر الماری کی طرف گئی اور الماری میں سے گٹار نکال کر لے آئی۔ میں دل میں بڑا خوش ہوا کہ ہسپانوی میوزک سننے کا موقع مل رہا ہے۔ بلانشے نے گٹار کی تاروں کو تھوڑا سر میں کیا اور پھر ایک دم سے تاروں پر ہاتھ مارا۔ ایک جھنکار پیدا ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی بلانشے کی نازک انگلیاں گٹار کی تاروں پر چلنے لگیں اور کمرے کی فضاء ہسپانوی میوزک کے زیر و بم سے گونج اٹھی۔ میوزک کی لے کبھی ایک دم تیز ہو جاتی جیسے بادلوں کی گرج میں تیز بارش ہو رہی ہو اور کبھی لے اتنی دھیمی ہو جاتی جیسے کسی وادی میں ندی بڑے سکون سے بہہ رہی ہو۔ یہ خاص ہسپانوی میوزک کی لے تھی۔ اس میں جذبات کی شدت بھی تھی اور جذبات کی نرم روی بھی تھی۔ یہ حجازی میوزک کی لے تھی جو ہسپانوی نصرانیوں کے رگ و پے میں رچ بس چکی تھی۔ مجھے ایسے لگا جیسے وقت آٹھ سو سال پیچھے کی طرف پلٹ گیا ہے اور میں کسی مور سردار کے

پائیں باغ میں بیٹھا ہوں اور تیونس کی کوئی مغنیہ چھتارے پر رجزیہ گیت کی دھن بجا رہی ہے۔

اور پھر ایک بار تیزی سے گٹار پر انگلیوں کو جھنجھنانے کے بعد بلانشے کا ہاتھ ایک دم رک گیا اور کمرے میں ایک ایسی خاموشی چھا گئی جس میں گٹار کے سر ابھی آہیں بھرتے محسوس ہو رہے تھے۔ ہم نے تالیاں بجاتے ہوئے بلانشے کا شکریہ ادا کیا۔ بلانشے کے پروفیسر باپ نے بلند آواز میں کہا:

''اولے! اولے!''

اور پھر اٹھ کر اپنی بہو کا ماتھا چوم لیا۔

پروفیسر پونیتاروں کی حویلی میں بسر کی ہوئی وہ رات مجھے خواب کی طرح لگی۔ دوسرے روز ہم نے پروفیسر راور اس کی بہو بلانشے سے اجازت لی اور ملاغہ سے غرناطہ جانے والی بس میں سوار ہو کر اپنی اگلی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ سپین کی میری سیاحت کا آغاز بڑا رومانوی انداز میں ہوا تھا۔ سپین میں میری پہلی رات بڑے خوب صورت اور رومان پرور ماحول میں بسر ہوئی تھی۔

ہماری بس غرناطہ کی طرف رواں تھی۔ موسم بڑا خوشگوار تھا۔ نیلا آسمان روشن اور چمکیلا تھا۔ وادیاں، کھیت اور پہاڑیاں گذر رہی تھیں۔ جگہ جگہ سرو اور کھجور کے درختوں کے جھنڈ نظر آتے جن کے درمیان چھوٹے چھوٹے دیہاتی مکانوں کی سفید دیواریں چمکتی نظر آتیں۔ کھیتوں میں سروں پر تنکوں کے ہیٹ جمائے کسان کام کر رہے تھے۔ دور سے کسی گرجے کا مخروطی مینار بھی نظر آ جاتا۔ مجھے خیال آیا کہ کبھی یہاں مسجدوں کے مینار بھی ہوا کرتے تھے مگر وہ مسجدیں تاریخ کے دھندلکوں میں گم ہو گئیں۔ ان مسجدوں کی اذانیں خاموش ہو گئیں۔ مور مسلمانوں کی سلطنت کو ایسا زوال آیا کہ پھر اندلس میں ایک بھی مسلمان باقی نہ بچا۔ اے دل! تیرے پاس جتنے آنسو

ہیں' آج اندلس کی سرزمین پر بہادے۔ وہ جلال و جمال والے لوگ کہا چلے گئے؟ میں نے اپنا سر بس کی کھڑکی کے ساتھ لگا دیا۔ میری آنکھیں بند تھیں اور بند آنکھوں میں عبرت گاہ اندلس کے آنسو کپکپا رہے تھے۔

ملاغہ اور غرناطہ کے درمیان ایک شہر آتا ہے جس کا نام ہوجا ہے۔ بس ملاغہ سے چل کر کوئی دو گھنٹے میں یہاں پہنچی۔ یہاں ایک بازار تھا جس کی دکانوں میں پلاسٹک کی گھریلو استعمال کی چیزیں اور الیکٹرانکس کا سکامن بھرا پڑا تھا۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ تنکوں کے ہیٹ والے کسان اور مزدور جگہ جگہ چلتے پھرتے نظر آرہے تھے۔ قہوے کی دکانوں کے باہر بھی لوگ کرسیوں پر بیٹھے قہوہ پیتے ہوئے خوش گپیوں میں مشغول تھے۔ ایک رستوران میں ریڈیو پر کوئی ہسپانوی گانا بج رہا تھا۔ دکانوں کے اوپر جو مکان تھے' ان کی جھکی ہوئی گیلریوں میں پھولوں والے گملے پڑے تھے۔ میں اور سباطی اور دیر تک لوجا شہر کے بازاروں اور اونچی نیچی جگہوں کی سیر کرتے رہے۔ گلیوں میں مکانوں کے باہر اکثر عورتیں بیٹھی ایک دوسرے سے اونچی آوازوں میں باتیں کررہی تھیں۔ بڑے بازار کے کونے میں ایک گرجا گھر کا مینار دور سے دکھائی دے رہا تھا۔ سکول کے لڑکوں کا ایک دستہ بجاتا بازار میں سے گذرا۔ لڑکوں نے رنگ برنگی وردیاں پہن رکھی تھیں۔ ہینڈ پر وہ ہسپانوی دھن بجا رہے تھے۔

جب ہم واپس بس سٹینڈ پر آئے تو ہماری بس اپنے سفر پر روانہ ہونے کے لئے تیار کھڑی تھی۔ لوجا سے غرناطہ کی طرف ہمارا سفر شروع ہوگیا۔ دن کے تیسرے پہر ہم غرناطہ کے مضافات میں داخل ہو چکے تھے۔ غرناطہ ''سیرانوار'' کے دامن میں پہاڑیوں کے اوپر واقع ہے۔ ان پہاڑیوں کے نشیب میں مکان بنے ہوئے ہیں۔ وادی میں دو دریا بہتے ہیں۔ دریائے جینل ریت پر سے لہراتا ہوا گذرتا ہے جبکہ دوسرا دریا ڈورو پتھروں کے درمیان راستہ بناتا ہوا گذرتا

ہے۔ آگے جا کر دونوں دریا مل جاتے ہیں۔ وغا کے میدان میں یہ ایک دریا کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہاں دریا کے آس پاس کی وادی ناشپاتی، انجیر، انگور، شہتوت اور سنگتروں کے سرسبز باغ ہیں۔ اس جنت نظیر وادی کو ہری بھری چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں نے چاروں طرف سے اپنی آغوش میں لے رکھا ہے۔

غرناطہ زیادہ تر جدید شہر میں تبدیل ہو چکا ہے۔ اونچی اونچی ماڈرن بلڈنگیں، شاپنگ پلازا اور ڈسکوکلبز جگہ جگہ نظر آتی ہیں لیکن قصر الحمراء کے آس پاس پرانا غرناطہ آج بھی اپنے پرانے محرابی دروازوں اور حویلیوں کی ٹھنڈی نیم روشن ڈیوڑھیوں اور فوراوں کے صحن والے مکانوں کے ساتھ اسی شان کے ساتھ موجود ہے اور عہدِ ماضی کے درخشاں دور کی یاد دلاتا ہے۔ قصر الحمرا غرناطہ کی پہاڑیوں کے اوپر واقع ہے۔ اس قلعے میں ہسپانیہ کے مسلمان حکمرانوں کے محلات ہیں، غرناطہ کا شہر ان پہاڑیوں کے دامن میں آباد ہے۔ قصر شاہی اس قلعے کا ایک حصے ہے۔ قصر الحمراء کے ایوان اور باغات آج بھی رشک جنت ہیں۔ لیکن میں یہ آگے چل کر پوری تفصیل سے بیان کروں گا۔ ابھی تو میں غرناطہ کی سرزمین پر بس سے اترا ہی ہوں۔ وہ غرناطہ جس کو میں یورپ کا تاج محل کہوں گا، ایک ایسا تاج محل جس کے مرمریں ایوانوں میں مسلمانوں کی تاریخ کا ایک پرشکوہ زریں محو خواب ہے۔

سباطی نے بس سے اترتے ہی کھلی فضاء میں بازو کھول کر گہرا سانس بھرا اور بولا:

''مجھے غرناطہ کی فضاء میں اپنے آباء واجداد کے لگائے ہوئے سیاہ گلابوں کی خوشبو آ رہی ہے۔''

اس مورعرب کے اس شاعرانہ مگر حقیقت افروز تصور نے مجھے بڑا متاثر کیا۔ غرناطہ کی خواب انگیز رومان پرور کلاسیکی فضاؤں میں مسلمانوں کے لگائے ہوئے سرخ اور سیاہ گلابوں کی خوشبو

میں بھی محسوس کرنے لگا تھا۔ میں نے سباطی سے کہا:

''میں چاہتا ہوں کہ یہاں سے سیدھا قصر الحمراء کی زیارت کو چلا جائے۔''

سباطی نے پیکٹ میں سے سگریٹ نکالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا:

''قصر الحمرا کو غروب آفتاب کے وقت نہیں بلکہ طلوع خورشید کے وقت دیکھیں گے۔''

مجھے اس کی تجویز پسند آئی۔ سباطی نے اپنا ٹورسٹ بیگ کاندھے سے لٹکا لیا۔ میں نے اپنا تھیلا پشت پر لٹکا لیا تھا۔ ہمارے پاس اس کے سوا اور کوئی سامان نہیں تھا۔ ہم ایک قریبی رستوران میں گھس گئے۔ یہاں کا ماحول بھی پورا مشرقی تھا۔ رستوران کے ستون محراب دار تھے۔ اگرچہ یہ معمولی سا ریستوران تھا مگر ہر میز پر ایک گلدان ضرور تھا جس میں رنگ برنگ پھول مسکرا رہے تھے۔

یہاں ہم نے کافی کے ساتھ برگر کھائے اور کچھ دیر بیٹھے باتیں کرتے اور غرناطہ کی سیر کا پروگرام بناتے رہے۔ میں نے سباطی سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں کسی ہسپانوی خانہ بدوش قافلے کے ساتھ بھی سفر کرنا چاہتا ہوں۔ سباطی نے ایک ہاتھ اپنے کان سے لگایا اور بولا:

''دوست! ایسا کبھی بھول کر بھی نہ سوچنا۔''

''کیوں؟'' میں نے سوال کیا۔

سباطی کہنے لگا:

''کیا تمہیں معلوم نہیں کہ سپین کے خانہ بدوش جرائم پیشہ لوگ ہوتے ہیں۔ جہاں پڑاؤ ڈالتے ہیں، وہاں دو تین ڈاکے مارے بغیر آگے نہیں جاتے۔ قتل و خون ریزی ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ پولیس بھی ان کا پیچھا نہیں کرتی۔''

یہ ساری باتیں میں نے سُن رکھی تھیں۔ لیکن اس کے باوجود لاہور سے یہ عہد کر کے چلا تھا

کہ سپین پہنچ کر کسی خانہ بدوش قافلے کے ساتھ کچھ دور تک ضرور سفر کروں گا۔ میں نے سباطی سے پوچھا کہ خانہ بدوش عام طور پر کس علاقے میں سفر کرتے ہیں۔ وہ بولا:

''ہسپانوی جپسی سارے ملک میں پھرتے رہتے ہیں لیکن عام طور پر وہ قرطبہ سے سیوائل اور کتیلہ کی طرف زیادہ دیکھے جاتے ہیں۔''

''کیا وہ شہروں میں نہیں آتے؟''

''شہروں میں وہ ڈیپارٹمنٹل اور گروسری سٹوروں سے چیزیں چرانے کے لیے کبھی کبھی ضرور آجاتے ہیں۔''

''کیا وہ وائن سٹوروں سے شراب وغیرہ نہیں چراتے؟''

سباطی ہنس کر بولا:

''جنگلی انگوروں کی شراب وغیرہ وہ خود کشید کر لیتے ہیں۔ وائن یہاں کوئی چرانے والی شے نہیں ہے۔ یہ تو دیہات کے ہر گھر میں تیار ہوتی ہے۔''

غرناطہ کے جس ریستوران میں ہم بیٹھے تھے' اس کے باہر بھی فٹ پاتھ پر لوگ پتھر کے بنچوں پر بیٹھے کافی وغیرہ پی رہے تھے۔ اور خوب اونچی آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ میں نے سباطی سے پوچھا کہ رات گذارنے کا کیا پروگرام ہے؟

''کیا غرناطہ میں تمہارا کوئی پروفیسر واقف نہیں ہے۔''

سباطی مسکراتے ہوئے کہنے لگا:

''غرناطہ بڑا شہر ہے' یہاں میرا کوئی جاننے والا نہیں ہے۔ اگرچہ یہاں کے لوگوں میں عربوں کی مہمان نوازی کی روایت پوری طرح موجود ہے مگر پھر بھی آج کے ہائی ٹیکنیکل سائنسی دور میں زندگی یہاں بھی بے حد تیز رفتار ہے اور کوئی کسی کو زیادہ دیر تک یاد نہیں رکھ سکتا۔''

''یہاں کوئی سرائے وغیرہ تو ضرور ہوگی' آخر یہاں دنیا کے ہر ملک سے سیاح آتے ہیں۔''

سباطی نے کافی کا آخری گھونٹ پی کر پیالی خالی کی اور کہا:

''اس کی تم فکر نہ کرو دوست! کوئی نہ کوئی بندوبست ہو جائے گا۔ ویسے تمہارا غرناطہ میں کتنے دن قیام کرنے کا ارادہ ہے؟''

سباطی نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا:

''میں تو زیادہ سے زیادہ دو روز ٹھہروں گا۔ پیچھے میری کلاسیں شروع ہونے والی ہیں اور مجھے ابھی میڈرڈ اور بارسلونا بھی جانا ہے۔''

میں نے کہا: ''دوست میں پہلی بار سپین آیا ہوں۔ یہ وہ ملک ہے جہاں قدم قدم پر تاریخ عہد رفتہ کو دہراتی ہے اور مسلمانوں کی گمشدہ جنت کے باغات دکھاتی ہے۔ میں اس جنت کے ایک ایک باغیچے' اس کے محلات کے ایک ایک دریچے کو دیکھنا چاہتا ہوں۔''

سباطی کندھے سکیڑ کر بولا:

''تو ٹھیک ہے' تم جتنے دن چاہے یہاں رہ جاؤ۔ میں پرسوں نہیں تو زیادہ سے زیادہ تیسرے دن بعد یہاں سے آگے روانہ ہو جاؤں گا۔''

میں نے کہا: ''چلو یہ بعد میں دیکھ لیں گے' ابھی تو یہ بتاؤ کہ رات کہاں بسر کی جائے گی۔ کیونکہ میرے پاس جو معمولی سی سپینش کرنسی ہے' وہ صرف کھانے پینے اور سفر خرچ کے لئے ہی پوری ہو جائے تو غنیمت ہے۔''

''اس حساب سے تم یہاں زیادہ دن کیسے رہ سکو گے؟ غرناطہ مہنگا شہر ہے۔''

میں نے کہا: ''میں کوئی کام تلاش کر لوں گا۔ میرا خیال ہے مجھے کسی سٹور یا گیس اسٹیشن پر

جاب مل ہی جائے گا۔"

سباطی کچھ سوچ کر بولا:

"ہاں یہاں کام تو مل جاتا ہے مگر میرا تمہیں مشورہ ہے کہ کسی گیس اسٹیشن پر نوکری نہ کرنا۔"

اس کی وجہ سباطی نے یہ بتائی کہ یہاں گیس اسٹیشن پر عام طور پر رات کی نوکری ملتی ہے اور رات کو ہی جرائم پیشہ لوگوں کے گروہ سڑکوں پر نکلتے ہیں اور ان کی زیادہ توجہ پٹرول پمپوں کی طرف ہی ہوتی ہے۔

میں نے اپنے دل میں کہا کہ دیکھا جائے گا۔ سباطی سے میں نے ایک بار پھر رات بسر کرنے کے ٹھکانے کے بارے میں بات کی تو وہ بولا:

"فکر نہ کرو۔ غرناطہ یونیورسٹی کیمپس کے ہوسٹل کے ایک ونگ میں یونیورسٹی کی انتظامیہ نے کچھ کمرے یورپی عیسائی طلباء کے لئے رکھے ہوئے ہیں۔ یورپ کے ملکوں سے جو کرسچین طلباء سپین کے مطالعاتی دوروں پر آتے ہیں، انہیں انہی کمروں میں ٹھہرایا جاتا ہے۔"

میں نے کہا: "مگر ہم تو عیسائی نہیں ہیں اور ہم یورپ کے بھی نہیں ہیں۔"

سباطی نے ایک آنکھ دباتے ہوئے کہا:

"یونیورسٹی کا ایک کلرک میرا واقف ہے، میں جب بھی یہاں آتا ہوں تو وہ میرا یونیورسٹی میں ٹھہرانے کا انتظام کر دیتا ہے۔ تم بھی میرے ساتھ ہی ٹھہر جانا۔ یہاں سے فارغ ہو کر ہم اس کلرک کے گھر چلیں گے۔"

مجھے اطمینان ہو گیا کہ غرناطہ میں میرے قیام کا انتظام ہو گیا تھا۔ سباطی پر مجھے بھروسہ تھا کہ وہ تعلقات اور اثر رسوخ رکھنے والا لڑکا ہے۔ شام ہو گئی۔ بازار روشنیوں سے جگمگانے لگے۔

سباطی نے تھیلا میز پر سے اٹھا کر کاندھے پر لٹکاتے ہوئے کہا:

''چلو یونیورسٹی کیمپس کوارٹرز میں چلتے ہیں' میرا کرک دوست وہیں ایک کوارٹر میں رہتا ہے۔''

ہم بازار کے چوک میں سے ایک بس میں سوار ہوئے اور یونیورسٹی کیمپس پہنچ گئے۔ کیمپس کی عمارت کا حسن تعمیر بھی خالص مشرقی اور مورش تھا۔ بہت بڑی دومنزلہ عمارت تھی جو چاردیواری کے اندر تھی۔ گیٹ پر ایک چوکیدار موجود تھا۔ سباطی نے سپینش زبان میں اس سے بات کی اور اپنے کلرک دوست کا نام لیا۔ چوکیدار نے گیٹ کا چھوٹا دروازہ کھول دیا۔ ہم کیمپس کے احاطے میں داخل ہوگئے۔ سرو کے درختوں کے درمیان ایلگول پتھر والی چھوٹی سی سڑک تھی۔ دونوں جانب لیمپ پوسٹ روشن تھے۔ سباطی کچھ دور چلنے کے بعد ایک طرف مڑ گیا۔ سامنے یونیورسٹی ملازموں کے کوارٹروں کی قطار نظر آئی جہاں ہر کوارٹر کے باہر ایک لیمپ روشن تھا۔

ہم ایک کوارٹر کے سامنے جا کر رک گئے۔ کوارٹر کے باہر چھوٹا سا صحن تھا جس کی دونوں جانب گارڈینیا کی قد آدم باڑھ تھی۔ ایک چھ سات سال کی بچی نے سباطی کو دیکھا تو بھاگ کر اندر چلی گئی۔ سباطی نے مسکرا کر کہا:

''یہ میرے دوست کاستیلو کی بیٹی ہے' وہ اندر میری اطلاع کرنے گئی ہے۔''

ایک منٹ بھی نہیں گذرا تھا کہ کوارٹر کے دروازے میں سے ایک دراز قد نوجوان مسکراتا ہوا باہر نکلا۔ اس نے سباطی سے بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اور ہسپانوی زبان میں کچھ کہا۔

سباطی نے اس کے ساتھ میرا تعارف کرایا۔ یہ نوجوان غرناطہ یونیورسٹی کے کسی آفس میں کرک تھا۔ خوش شکل نوجوان تھا۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر بڑی محبت سے دبایا اور انگریزی میں کہا:

''سینور! تم سے مل کر بڑی خوشی ہوئی، تم میرے مہمان ہو، اندر آ جاؤ پلیز۔''

اسکا نام کاستیلو تھا۔ اس کی بیوی بھی نوجوان تھی اور بڑی خوش اخلاقی سے پیش آئی۔ سباطی نے اسے بتا دیا تھا کہ میں سپینش زبان نہیں جانتا۔ چنانچہ کاستیلو انگریزی میں بات کرنے لگا۔

کوارٹر کا چھوٹا سا کمرہ تھا مگر بڑی نفاست سے سجا ہوا تھا۔ ان دونوں میاں بیوی کی ایک ہی بیٹی تھی جسے وہ ساشنکا کہہ کر بلاتے تھے۔ ساشنکا نے بھی اپنی ماں کی طرح سر کے بیچ میں سے مانگ نکال کر دو چوٹیاں کر رکھی تھیں۔ یہ خالص مشرقی انداز تھا۔ رات کا کھانا ہم نے کاستیلو کے ہاں ہی کھایا۔ یہ درمیانے طبقے کے بمشکل گذارہ کرنے والے لوگ تھے۔ مگر انہوں نے کمال مہمان نوازی کا ثبوت دیتے ہوئے تین ڈشیں تیار کر دیں۔ پیاز کا سوپ بھی ساتھ تھا۔ اور مچھلی بھی فرائی کی ہوئی تھی۔ کھانے کے بعد ہماری تواضع برازیل کی کافی سے کی گئی۔ اس کے بعد کاستیلو ہمیں ساتھ لے کر ہوسٹل ونگ میں آ گیا۔ یہاں کونے میں ایک کمرہ اس نے ہمارے لئے کھلوا دیا۔ کمرے میں دو پلنگ لگے تھے۔ غسل خانہ ساتھ ہی تھا۔ بستر بچھے ہوئے۔ دو دو پتلے کمبل ہر پلنگ کی پائنتی پر تہہ کئے پڑے تھے۔ کاستیلو نے کہا: ''ناشتہ صبح آپ لوگ میرے ساتھ کریں گے۔''

سباطی کہنے لگا: ''میں اور میرا دوست ہم صبح ذرا جلدی قصر الحمرا دیکھنے جائیں گے۔ آپ لوگوں کو ناشتے کی تکلیف نہیں دینا چاہتا۔ ہم وہیں قصر الحمرا کے رستوران میں ناشتہ کریں گے۔''

میں بھی سباطی کی تائید کی اور کاستیلو کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا:

''آپ بالکل تکلف نہ کریں۔ ہم تو سیاح ہیں، گھر سے نکلے ہی آوارہ گردی کرنے ہیں۔ اصل میں میں قصر الحمراء کے ایوانوں اور الحمرا کے باغات کو طلوع آفتاب کے وقت دیکھنا چاہتا ہوں۔''

کاستیلو مسکرایا۔ کہنے لگا:

''جیسے آپ کی مرضی۔ مگر دوپہر کے کھانے پر میں آپ کا انتظار کروں گا۔ آج کل میں نے یونیورسٹی سے ایک ہفتے کی چھٹی لے رکھی ہے۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔''

سباطی نے بری عقل مندی کا ثبوت دیا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ ہم سیر و سیاحت کے لیے وہاں آئے تھے اور قصر الحمرا ایک ایسی جگہ ہے کہ جس کو دیکھنے کے لیے ایک دن کیا ایک عمر بھی کم ہے۔ یہ وہ قصر ہے کہ جس کی ہر اینٹ پر ایک عہد گذشتہ کی داستان ثبت ہے۔ ہم نے کمرے کی کھڑکی کھول دی تھی جس میں سے غرناطہ کی رات کی خوشگوار ہوا اندر آ رہی تھی۔ اس ہوا میں غرناطہ کے غلابوں کی خوشبو تھی۔ میں ان پھولوں کی خوشبو کو ضرور محسوس کر رہا تھا۔ یہ غرناطہ میں میری زندگی کی پہلی اور یادگار رات تھی۔ شدت جذبات سے مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ ہم دونوں رات دیر تک باتیں کرتے رہے، پھر نہ جانے کس وقت مجھے نیند آ گئی۔

میری خواہش تھی کہ میں سورج کو غرناطہ کے قصر الحمرا سے طلوع ہوتا دیکھوں۔ لین جب میری آنکھ کھلی تو صبح ہو چکی تھی۔ سباطی ابھی بھی سو رہا تھا۔ میں نے اسے جگایا تو اس نے بیدار ہوتے ہی سب سے پہلے سرہانے کی نیچے سے اپنی رسٹ واچ نکال کر دیکھی اور بولا:

''مائی گاڈ! آٹھ بج گئے۔ دوست! تم آج الحمرا کے باغوں سے سورج طلوع ہوتا نہ دیکھ سکے۔ مجھے اس کا افسوس ہے۔''

میں نے کہا: ''کوئی بات نہیں، کل صبح ہونے سے پہلے نکل چلیں گے۔''

ہم نے جلدی جلدی ناشتہ کیا اور یونیورسٹی کیمپس کے بس سٹاپ سے بس پکڑی اور غرناطہ کے بڑی چوک میں آ گئے۔

یہاں سے غرناطہ کے قلعے کے لئے ٹورسٹ بسیں چلتی ہیں۔ یہاں ہم ایک بس میں سوار

ہوگئے۔ بس غرناطہ کے قصرالحمرا کی پہاڑیوں کی طرف روانہ ہوئی۔ سارا راستہ سرسبز تھا۔ نیم پہاڑی سرک کی دونوں جانب سرو کے درختوں کی قطاریں تھیں۔ ایک پہاڑی کا موڑ کاٹ کر بس دوسری پہاڑی کے دامن میں پہنچی تو ہمیں سیرانوار کی پہاڑیوں پر قصرالحمرا کی فصیل اور چوکور برج دکھائی دیئے۔

تھوڑی دیر بعد بس قصرالحمرا کے آس پاس کے تنگ بازاروں اور پتھریلے فرش والی گلیوں میں سے نکل کر قلعے کے بڑے دروازے کے کشادہ صحن میں کھڑی ہوگئی۔ ہم بھی دوسرے سیاحوں کے ساتھ بس سے اترے' یہاں ہمیں پیشہ ور گائیڈز نے گھیر لیا۔ وہ سپینی اور انگریزی زبان میں سیاحوں کو اپنے ساتھ چلنے پر مجبور کر رہے تھے۔ سیاحوں کی ایک ٹولی ایک گائیڈ کے ساتھ چل پڑی۔ مجھے کسی گائیڈ کی ضرورت نہیں تھی۔ میرے ساتھ میرا ہم سفر دوست سباطی موجود تھا جو کئی بار الحمرا کے محلات کی سیر کر چکا تھا۔ اس نے میرا بازو پکڑا اور گائیڈز کو ہسپانوی زبان میں کچھ کہتا ہوا آگے بڑھا۔ قلعے کے دروازے پر پتھے کے چبوترے کے پاس سپینی گارڈ میز لگائے بیٹھے تھے۔ یہاں ہم نے اندر داخل ہونے کے لئے ٹکٹ خریدے اور الحمرا کے قلعے میں داخل ہوگئے۔ ایک بہت بڑا کشادہ صحن تھا جس وسط میں مربع برج نظر آیا۔ اس کے قریب سے ہوتے ہوئے ہم باب العدل کی طرف بڑھے سباطی نے کہا:

''مسلمانوں کے عہد میں یہاں عدالت لگا کرتی تھی اور چھوٹے چھوٹے مقدموں کا فیصلہ قاضی کیا کرتا تھا۔ اس لئے اس کا نام باب العدل رکھا گیا۔''

یہاں ایک بوڑھا گائیڈ بوسیدہ وردی پہنے پتھر کے بنچ پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ ہم نے اسے اپنے ٹکٹ دکھائے اور باب العدل میں سے گذرتے ہوئے ایک تنگ سی راہ داری میں داخل ہوئے جس کے دونوں جانب دیواروں پر چنبیلی کی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ ساری راہ

داری چنبیلی کے پھولوں کی خوشبو سے مہک رہی تھی۔ راہ داری کے آخر میں پتھر کی سیڑھیاں چڑھ کی ہم ایک کشادہ صحن میں آ گئے۔ یہاں تین حوض تھے جن کا پانی خشک ہو چکا تھا۔ سباطی نے ان کی طرف اشارہ کیا اور کہا:

''عرب پہاڑوں کو کاٹ کر چشموں کا پانی ان حوضوں میں لائے تھے۔ اسی وجہ سے اس دالان کا نام حوضوں والا میدان پڑ گیا۔''

یہاں ہم نے ایک کنواں بھی دیکھا۔ آگے قصر الحمرا کا بڑا محرابی دروازہ تھا۔ اس دروازے میں سے گذر کر ہمیں الحمرا کے محلات میں داخل ہونا تھا۔ یہاں بڑے محرابی دروازے کی دونوں جانب سنگ مرمر کے بنچ تھے جن کے قریب ہی ایک وردی پوش بوڑھا گارڈ کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔ سباطی اس سے باتیں کرنے لگا۔ بوڑھے گارڈ نے ایک طرف اشارہ کیا۔ سباطی نے مجھے کہ بوڑھا گارڈ کہہ رہا تھا کہ قصر الحمرا کو دیکھنا ہے تو بوڑھی انطونیوں کے حجرے میں جا کر اسے ساتھ لے لو۔ میں نے اسے کہاں کہ ہمیں کسی گائیڈ کی ضرورت نہیں ہے۔

اس کے بعد ہم قصر الحمرا کے صدار محرابی دروازے میں سے گذر کر الحمرا میں داخل ہو گئے مجھے یوں لگا جیسے میں بہشت کے کسی حسین باغ میں داخل ہو گیا ہوں۔ میرے سامنے ایک سنگ سرخ کا کشادہ صحن تھا۔ جس کی دونوں جانب سنگ مرمر کے ستونوں کی قطاریں تھیں۔ کونے میں جالی دار بارہ دری تھی۔ کارنس کے حاشیوں اور دیواروں پر نازک نقش و نگار کندہ تھے۔ محرابوں کے اوپر عربی کی عبارتیں لکھی تھیں۔ سباطی نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہیں پڑھ کی سنایا اور کہا:

''یہ قصر الحمرا کے بانی مسلمان بادشاہوں کے اقوال ہیں۔ ان عبارتوں میں الحمرا کے شکوہ و جلال کی تعریف بھی کی گئی ہے۔''

صحن کے درمیان ایک حوض تھا۔ حوض کا فوارہ اچھل رہا تھا۔ حوض میں رنگ برنگی مچھلیاں تیر رہی تھیں۔ حوض کے کناروں پر گلاب کے کھلے ہوئے پھولوں کے گملے پڑے ہوئے تھے۔ سباطی نے کہا:

''اس حوض کا نام عربوں نے البیرقہ رکھا تھا۔''

ہم اس حوض کے قریب سے ہوتے ہوئے ذرا آگے گئے تو آگے ایک محراب تھی۔ محراب کی پیشانی پر قرآن کریم کی ایک آیت مبارکہ کندہ تھی۔ آگے پھر ایک بہت وسیع صحن تھا۔ اس صحن کے وسط میں وہ مشہور حوض تھا جس کے چاروں طرف پتھر کے شیر بنے ہوئے تھے۔ شیروں کے منہ سے شفاف پانی اچھل اچھل کر حوض میں گر رہا تھا۔ یہ بارہ شیر تھے۔ ان کے منہ سے پانی نکل کر بڑے بڑے سنگ جراحت کے پیالوں میں گرتا تھا۔ سباطی نے بتایا کے یہ نقرئی پانیوں والا حوض عبداللہ کے عہد میں تعمیر کیا گیا تھا۔ حوض کے قریب پھولوں کا ایک وسیع تختہ تھا۔ سباطی نے اس تختے کی طرف اشارہ کیا اور کہا:

''یہاں مسلمان بادشاہوں کے عہد میں سنگ مرمر اور دوسرے قیمتی پتھروں کی روشیں ہوا کرتی تھیں۔ عیسائی وہ تمام قیمتی پتھر اکھاڑ کر لے گئے۔ اب یہاں انہوں نے پھولوں کے تختے بنا دیئے ہیں۔ یہ عیسائی حکمران وہ فرانسیسی تھے جو مسلمانوں کے زوال کے بعد غرناطہ پر قابض ہو گئے تھے۔''

اس کشادہ صحن کو شیروں والا میدان کہتے ہیں۔ اس کے چاروں طرف دالان ہیں جہاں بڑے نازک سنگ مرمر کے ستون کھڑے ہیں۔ سباطی نے بتایا کہ کسی زمانے میں ان ستونوں پر قیمتی ہیرے جواہرات جڑے تھے۔ لیکن اب تم دیکھ رہے ہو کہ یہاں کچھ بھی نہیں ہے۔''

میں نے ستونوں کو قریب سے دیکھا۔ ستونوں پر اس طرح کے نشان پڑے ہوئے تھے

جیسے وہاں سے کوئی شے کھرچ کھرچ کر نکالی گئی ہو۔ شیروں والے میدان کے آگے ایک اور محرابی پھاٹک ہے۔ یہ پھاٹک ایوان بنی سراج میں کھلتا ہے۔ جب ہم ایوان بنی سراج میں داخل ہوئے تو سباطی کہنے لگا:

''لوگوں میں یہاں یہ بات عام طور پر مشہور ہے کہ اس ایوان میں رات کو کبھی کبھی انسانوں کی ایسی آوازیں سنائی دیتی ہیں جیسے وہ سرگوشیوں میں باتیں کر رہے ہوں۔ کہتے ہیں کہ کبھی کبی یہاں رات کو زنجیروں کی جھنکاریں بھی سنائیں دیتی ہیں۔ مگر میں اسے محض وہم سمجھتا ہوں۔''

ایوان بنی سراج کی محرابوں اور سنگ سیاہ کے بازک ستونوں اور چوکور بارہ دریوں کو دیکھ کر میں عالم حیرت میں گم ہو گیا۔ وہاں ایک عجیب شکوہ اور جلال کی فضاء تھی۔ میں نے سباطی سے کہا:

''میں کچھ دیر یہاں بیٹھنا چاہتا ہوں۔''

''ہاں۔ اچھا خیال ہے۔'' سباطی بولا۔ ''میں بھی یہاں کچھ دیر آرام کروں گا۔ ایک ایک سگریٹ پیتے ہیں۔''

میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا:

''دوست! میں یہاں سگریٹ نہیں پیوں گا' مجھے ایسے لگ رہا ہے کہ میں ایک بہت بڑی اور مقدس مسجد میں پھر رہا ہوں۔''

سباطی نے مسکراتے ہوئے سگریٹ سلگا لیا اور بولا:

''تمہیں ایسا محسوس کرنے کا پورا حق ہے مگر میں تو ایک سگریٹ ضرور پیوں گا۔''

سباطی نے سگریٹ کا کش لگا کر دھواں منہ سے چھوڑا تو یقین کریں کہ زندگی میں شائد پہلی بار مجھے سگریٹ سے نفرت ہو گئی۔ سباطی کو قصر الحمرا کے سارے نشیب و فراز کا پتہ تھا۔ اب مجھے

محسوس ہوا کہ سباطی سے اچھا اور تجربہ کار گائیڈ مجھے سارے غرناطہ میں نہیں مل سکتا تھا۔ اسے وہ افسانوی روایات بھی یاد تھیں جو الحمرا کے کسی نہ کسی ایوان سے وابستہ کر دی گئی تھیں۔ ایوان بنی سراج کے متعلق بھی سباطی نے مجھے ایک بڑی پراسرار روایت سنائی۔ کہنے لگا:

''کہتے ہیں کسی زمانے میں، یعنی ہمارے ماڈرن زمانے میں، یہی کوئی بیس تیس برس پہلے ایوان بنی سراج یا بنو سراج ایک بوڑھا ہسپانوی گارڈ رات کو ڈیوٹی دیا کرتا تھا۔ اس بوڑھے سپاہی کا کہنا ہے کہ ایک رات میں ایوان میں پہرہ دے رہا تھا کہ میں نے انسانی قدموں کی آہٹ سنی۔ میں سمجھا کہ کچھ سیاح رات کو ایوان میں آ گئے ہیں۔ چنانچہ میں اس طرف بڑھا جس طرف سے انسانی قدموں کی آواز آئی تھی۔ جیسے ہی میں ایوان کے رارہ دری والے کونے میں پہنچا تو میں حیرت زدہ ہو کر وہیں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ میری آنکھوں کے سامنے چار مسلمان سردار زرہ بکتر پہنے بڑی شان سے ستونوں کے درمیان ٹہل رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں چمکیلے خنجر تھے جن پر ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ میں دہشت زدہ ہو کر وہاں سے واپس بھاگ آیا۔''

سباطی نے بوڑھے ہسپانوی گارڈ کی بات ختم کرتے ہوئے میرے طرف دیکھا اور بولا:

''یہ روایت سارے غرناطہ میں مشہور ہو گئی ہے، بعض توہم پرست لوگوں کا خیال ہے کہ ایوان بنی سراج میں رات کو مسلمان سرداروں کی روحیں اترتی ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے؟''

میں خاموش رہا۔ سباطی نے اصرار کر کے پوچھا تو میں نے کہا:

''دوست! میرا خیال ہے مسلمان سرداروں کی روحیں یہاں رات کو ضرور آتی ہوں گی۔''

سباطی مسکرانے لگا۔

''اپنا اپنا خیال ہے۔''

ہم ایوان بنی سراج میں سے نکل کر ایک اور محرابی دورازے کی طرف بڑھے اس دروازے کی دوسری جانب ایک اور ایوان تھا۔ اس ایوان کا دروازہ بھی عربوں کی ہرن مند اور احساس حسن و جمال کا اعلیٰ ترین نمونہ تھا۔ اس کا فرش سفید سنگ مرمر کا تھا۔ سباطی کہنے لگا:

''اس ایوان کو دو بہنوں کا ایوان بھی کہتے ہیں۔ اس ایوان کے ساتھ بھی کئی شاعرانہ اور افسانوی روایات وابستہ ہیں۔ مگر میں انہیں افسانوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔''

اس ایوان کے دونوں جانب قبے تھے جن کے بارے میں سباطی نے بتای کہ یہاں بادشاہ آرام کیا کرتے تھے۔ ہم ایک قبے میں داخل ہوئے۔ سنگ مرمر کی انتہائی نازک جالیوں میں سے دن کی روشنی چھن چھن کر آرہی تھی۔

یہاں سے ہم ایک اور ایوان میں آگے۔ یہاں میں نے دیواروں کے ساتھ لپٹی ہوئی بیل کو دیکھا جس میں سرخ رنگ کے چھوٹے چھوٹے پھول کھلے ہوئے تھے۔ سباطی نے بتایا:

''اس نیل کو آس کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ چنانچہ ای بیل کی نسبت سے اس ایوان کو بھی دیوان آس کہتے ہیں۔''

ایوان آس کے آخر میں چھوٹی سی راہ داری سے گذرے تو ہم ایک اور ایوان میں پہنچ گئے۔ میں دیکھا کہ یہ ایوان باقی تمام ایوانوں سے زیادہ کشادہ اور فراخ تھا اور اس کے ستعن بھی سنگ مرمر اور سنگ سرخ کے تھے۔ ایوان کی چھت میں پھولوں کے شگوفے اور زریں تاج تراش کر بنائے گئے تھے۔ چھت کے قریب دیواروں میں سنگ مرمر کی جالیاں لگی تھیں جن میں سے دن کی روشنی اندر آرہی تھی۔ ایوان کے فرش پر رنگین ٹائلیں لگی تھیں دیوراون کی رنگین گل کاری دیکھ کر میں تو دنگ رہ گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ جنت کے کسی باغ کی دیوار ہے۔ سباطی کہنے لگا:

''اس ایوان کا نام ایوان السفیر ہے۔ کہ جو دالان تم دیکھ رہے ہو اسے ''بارکا'' کے نام سے

بھی پکارا جاتا ہے اس ایوان میں غرناطہ کے مسلمان شہنشاہ اپنے مہمانوں کا استقبال کیا کرتے تھے۔"

اس کے بعد ہم ایوان الاسد میں آ گئے۔

میرے خیال میں ایوان الاسد باشبہ قصر الحمرا کا سب سے حسین اور پرشکوہ ایوان ہے۔ یہاں دیواریں زرد اور نیلے رنگ کی ٹائیلوں کی ہیں چاروں جانب جالی دار برآمدے ہیں۔ محرابوں کی مقش پیشانیوں پر عربی آیات کندہ ہیں۔ چاروں جانب خوش نما چمکیلی نیلی اور زرد ٹائیلوں کے حاشئے کھنے ہوئے ہیں۔ ہم ایوان کی سیر کرنے کے بعد دوسرے جانب ایک پھولوں بھرے قطعے میں آ کر بیٹھ گئے۔ سباطی نی کہا:

"قصر الحمرا کی تعمیر کا کام ۱۲۳۸ء میں اندلس کے آخری مسلمان تاجدار بنی الاحمر نے شروع کیا تھا۔ اس کی وفات کے بعد بھی قصر الحمرا کی تعمیر کا کام جاری رہا۔ محمد خامس الغنی باللہ نے الحمرا کی تعمیر اور آرائش میں سب سے زیادہ حصہ لیا۔ اس نے یہاں باغات لگوائے' حمام بنوائے اور ایسے ایسے پودے اور درخت ساری دنیا سے منگوا کر لگوائے کہ جنہیں ایک نظر دیکھنے کے لیے آج دنیا کے کونے کونے سے سیاح یہاں کھنچے چلے آتے ہیں۔ جب غرناطہ بھی نصرانیوں کے قبضے میں آ گیا اور اندلس پر مسلمانوں کی عظمت کا چراغ بجھ گیا تو فرانسیوں نے الحمرا کو تباہ کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ مطلا پچی کاری کھرچ دی گئی۔ جہاں عقیق، زمرد اور مجان کے قیمتی پتھروں سے نقش ونگار بنے تھے۔ وہاں سے سارے قیمتی پتھرا کھاڑ ڈالے گئے۔ اس کے باوجود قصر الحمرا کا جلال اپنی جگہ پر قائم ودائم ہے۔"

میں اندلس کے مسلمان سلاطین کی عظمتوں کی یادگاروں کے درمیاں بیٹھا ان کے عروج و زوال پر غور کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کوشش اس لئے کر رہا تھا کہ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ جس

قوم نے اس خطہ زمین پر آٹھ سو برس تک حکومت کی، علم وادب کے ایوانوں میں ایسی شمعیں روشن کیں کہ جن کی روشنی نے یورپ کے اندھیروں کو اجالوں میں بدل دیا اور یورپ کو علم وابد اور علم کے ہر میدان میں نئی منزلوں کا سراغ عطا کیا اور سائنس کی دنیا میں ایسے کارنامے انجام دیئے کہ جن کی راہ نمائی میں یورپ آج بام عروج پر ہے تو پھر اس سلطنت کو کیسے زوال آ گیا۔

میں نے سباطی سے پوچھا تو وہ کہنے لگا:

''اس موضوع پر بے شمار کتابیں لکھی جا چکی ہین اور لکھی جا رہی ہیں۔ موٹی سی بات میں تمہیں بتاتا ہوں کہ مسلمانوں کا آپس میں نفاق اور نسلی امتیاز کا متکبرانہ احساس اس عظیم سلطنت کے زوال کا سبب بنا۔ جب تک اندلس کے مسلمان قرآن حکیم کی آیات اور نبی کریم ﷺ کی ہدایات پر عمل کرتے رہے، ان کی سطوت کے چراغ روشن رہے اور جب انہوں نے قرآن پاک کے احکامات اور نبی اکرم ﷺ کی ہدایات پر عمل کرنا چھوڑ دیا تو ان پر زوال کے سائے منڈلانا شروع ہو گئے اور پھر وہ وقت بھی آیا کہ اندلس میں سوائے غرناطہ کے مسلمانوں کے پاس دوسری کوئی جگہ نہ رہی اور بالآخر غرناطہ بھی ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔''

سباطی خاموش ہو گیا۔ اس کے چہرے پر ملال انگیز اداسی تھی۔ میں بھی چپ تھا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے قصر الحمرا کے در و دیوار بھی ہمارے ساتھ زوال کے غم میں شامل ہو گئے ہیں۔

کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد سباطنی کہنے لگا:

''افسوس اس بات کا ہے کہ مسلمانوں نے اندلس کی عبرت ناک تاریخ سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا۔ آج ساری دنیا میں مسلمانوں کی جو حالت ہے، وہ سب کے سامنے ہے۔ رنگ و نسل اور زبانوں نے مسلمانوں کو ایک دوسرے جدا کر رکھا ہے۔ کوئی مسلمان ملک، دوسرے مسلمان ملک کو دل سے دوست نہیں سمجھتا۔ صرف اوپر اوپر سے دوستی کا دم بھرا جاتا ہے۔ کہا یہ

منافقت مسلمانوں کو زیب دیتی ہے؟ ہرگز نہیں انفرادی شکل میں یہ منافقت ایک فرد کو نقصان پہنچاتی ہے مگر اجتماعی شکل میں ظاہر ہو کر یہ قوموں کو لے ڈوبتی ہے۔"

سباطی نے برجستہ جواب دیا:

"اسلام نے ہماری ایک منزل متعین کر دی ہے اب ہمیں اسی منزل کی طرف جانا چاہیے۔ اگر ہم خود خدا کی رسی کو ہاتھ سے چھوڑ دیں اور اپنی مرضی سے کوئی دوسری راہ اختیار کر لیں تو پھر ہمارا انجام سوائے تباہی کے اور کیا ہو سکتا ہے؟"

سباطی کی آواز بازگشت جیسے قصر الحمرا کے ایوانوں میں گونجنے لگی۔ اس لئے کہ یہ تاریخ کی آواز تھی۔ ماضی کا بار بار کا دہرایا ہوا سبق تھا۔

باب الاسد کی جانب سے سنگتروں کے پھولوں کی میٹھی خوشبو آ رہی تھی۔ میں نے بات کو ماضوع بدلتے ہوئے سباطی کی توجہ اس خوشبو کی طرف کرائی۔ اس نے ہلکا سا سانس کھینچ کر کہا:

"ہاں! یہ الحمرا کے باغات کے سرخ سنگتروں کے پھولوں کی خوشبو ہے۔ الحمرا کے باغوں میں یہ بہار کا موسم ہے۔ چلو۔ باغات کی سیر کرتے ہیں۔"

الحمرا کے باگ فردوس بریں کا نمونہ ہیں۔ باغ کے قطعوں کے بیچوں بیچ پانی کی نہریں بہتی ہیں جن کے سنگ مرمر کے فرش ہیں۔ نہروں میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر فواروں میں سے پانی اچھلتا نظر آتا ہے۔ سنگ مرمر کی نہروں کے کنارے سنگ سرخ کے گملوں کی قطاریں ہیں جن میں پھول بہار دے رہے ہیں۔ ایوانوں کی عقبی دیواروں پر آکاس کی بیلیں چڑھی ہوئی ہیں۔ جن میں جگہ جگہ کانسی پھول کھلتے ہیں۔ گھاس کے قطعوں میں گلاب کے پھولوں کی مربع کیاریاں ہیں۔ ان کیاریوں میں کہیں سرخ، کہیں زرد، کہیں سیاہ اور کہیں قرمزی گلاب کے پھول کھلے ہوئے ہیں۔ ہم سیاہ گلاب کی ایک کیاری کے پاس آ کر بیٹھ گئے۔ دھوپ بڑی

خوشگوار تھی۔ نیم گرم چمکیلی دھوپ کی فضاؤں میں ان گلابوں کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ سیاہ گلابوں کی پنکھڑیاں پیالوں کی طرح کھلی ہوئی تھیں۔ ان پھولوں میں سے کسی رنگ سیاہی مائل سرخ تھا، تو کوئی بالکل سیاہ ——— سباطی نے کہا:

''یہ پھول بھی عرب اپنے ساتھ یہاں لائے تھے۔ ہسپانیہ کو عرب مسلمانوں نے کیا کچھ نہیں دیا۔ ہسپانیہ کے عیسائی، عربوں کے احسان قیامت تک نہیں اتار سکتے۔''

سباطی نے ایک سیاہ پھول کی طرف اشارہ کیا اور بولا:

''یہ چھوٹی پھکڑیوں والا سیاہ پھول ہمارمراکش کا خاص گلاب ہے۔ یہ مور مسلمانوں کا تحفہ ہے جو انہوں نے ہسپانیہ کو دیا۔''

الحمرا کی باغات کی اونچی فصیل بھی پھولدار بیلوں میں چھپی ہوئی تھی۔ فصیل کے ساتھ ساتھ کھجور کے درختوں کے جھنڈ ایوان السفیر تک چلے گئے تھے۔ الحمرا کے پھولدار باغوں میں جو فواروں والی چھوٹی چھوٹی نہریں بہتی تھیں، ان کے آخر میں اوپر ایک چوکر مراکشی انداز کی بارہ درہ تھی جس کی دیوار کی ڈھال سنگ سرخ سے بنائی گئی تھی۔ اس ڈھال پر سے پانی چھوٹی چھوٹی رکاوٹوں سے ٹکراتا ترنم کے ساتھ سنگ مرمر کی نہر میں گرتا تھا۔ یہ پانی پہاڑ کو کاٹ کر ایک بہت بڑی نہر کی شکل میں غرناطہ کی پہاڑیوں میں آتا ہے اور وہاں سے چھوٹی چھوٹی دو نہروں کی صورت میں قصر الحمر میں داخل ہو جاتا ہے۔ یہی پانی الحمرا کے وسیع باغات کو سیراب کرتا ہے۔

دوسرے قطعے میں انجیر اور زیتوں کے درختوں کے درمیانے قد کے جھنڈ تھے۔ انجیر کے درختوں کی پھیلی ہوئی شاخوں پر گہرا سنی رنگ کی انجیریں لٹک رہی تھیں۔ مجھے لاہور کے سمن آباد میں اپنا علاقہ یاد آ گیا۔ جہاں میں رہتا ہوں، وہاں ایک چھوٹی سی گراؤنڈ کے کنارے انجیر کے دو درخت ساتھ ساتھ لگے ہیں۔ خدا جانے یہ درخت کس خوش ذوق آدمی نے یہاں لگا

دیئے تھے۔

بہار کے موسم میں ان درختوں پر انجیریں لگتی ہیں۔ مگر یہ انجیریں صرف ایک دو دن ہی بہار دکھلاتی ہیں۔ پھر محلے کے بچوں بے دست برد کا نشانہ بن جاتی ہیں۔ میں گھر سے ٹریڈیو اسٹیشن یا ٹی وی اسٹیشن جاتے ہوئے جب بھی اس درخت کو دیکھتا تو مجھے الحمرا کے باغات یاد آجاتے تھے۔ پھر میں تصور ہی تصور میں اندلس کی کسی خانہ بدوش حسینہ کو دیکھتا کہ آبنوسی مجیرے دونوں ہاتھوں میں تھامے وہ انجیر کے درخت کے قریب رقص کر رہی ہے۔ اندلس کے آسمان پر زرد چاند چمک رہا ہے۔ ایک خانہ بدوش چھتارہ بجا رہا ہے اور خانہ بدوش لڑکی مجیروں کی تال پر تھرک تھرک کر رک رک کر رقص کے دائرے میں گھوم رہی ہے۔

الحمرا کے باغ میں انجیر کے درخت کی انجیریں ابھی تک تو محفوظ تھیں۔ سباطی نی بتایا کہ یہاں پھول، توڑنے کی سخت ممانعت ہے۔ میں کہا:

''کسی کو کہا پتہ لگتا ہے۔ ہم ایک انجیر توڑ لیتے ہیں۔''

سباطی نے طنزا کہا:

''یہ خیال تو یہاں آنے والے غیر مسلم سیاحوں کے ذہن میں بھی نہیں آتا۔''

میں کچھ خفیف سا ہو کر چپ ہو گیا۔ واقعی میں نے ایس بات کہہ کر اپنی پس ماندہ اور غلامانہ ذہنیت کا اظہار کیا تھا۔ ہم وہاں سے نکل کر دوسرے باغ میں آگئے۔ یہاں قطعوں میں گلابوں کے علاوہ یورپ اور مشرقی وسطی کے ہر قسم کے پھولوں کے پودے لگائے گئے تھے۔ ایسے ایسے پھول کیاریوں میں کھلے تھے۔ کہ جنہیں میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ان سب پھولوں کی خوشبو نے مل کے ایک ایسی خوشبو کو جنم دیا تھا کہ طلسمی مہک مجھے خواب کے جزیروں میں لئے جا رہی تھی۔

سنگترے کے باغ میں جگہ جگہ درختوں کے جھنڈ تھے۔ ان درختوں کی شاخیں چھوٹے چھوٹے سفید پھولوں سے لدی ہوئی تھیں۔ ان پھولوں پر پھونرے جھوم رہے تھے۔ یہاں ایسی گہری اور میٹھی خوشبو تھی کہ مجھے ایسے لگا جیسے میں کسی پرفیوم کی بہت بڑی بوتل میں اتر گیا ہوں۔ سباطی نے سانس بھر کر کہا:

''یہ الحمرا کے باغ کی اصل خوشبو ہے، یہ خوشبو قصر الحمرا کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے ہے۔ تم جہاں جاؤ گے، یہ خوشبو تمہارے ساتھ جائے گی۔ سارا باغ اس خوشبو کے تصرف میں ہے۔''

اس سے آگے کھجوروں کے چھوٹے درختوں کے جھنڈ آ گئے۔ یہ درخت قد آدم تھے۔ مگر وہ پھل کے لدے ہوئے تھے۔ ان پر زرد، سنہری، نسواری اور سیاہ کھجوروں کے گچھے لٹک رہے تھے۔ شہد کی مکھیاں دیوانہ وار ان کھجوروں پر رقص کر رہی تھی۔

''دوست! یہ وہ پھل ہے جس کا درخت سلاطین اندلس کا بادشاہ عبدالرحمان اول اپنے ساتھ لایا تھا، کھجور کا درخت عرب کلچر کی علامت ہے۔ ان عرب سلاطین سے پہلے ہسپانیہ بلکہ یورپ کی سرزمین اس درخت سے ناوقف تھی۔ یہاں کھجوروں کے پھل ان کے پتوں اور ان کی شاخوں اور ان کے تنوں سے ایسی ایسی چیزیں بنائی جاتی ہیں کہ تم دیکھو تو حیران رہ جاؤ۔''

ان درختوں کے قریب ہی بنچ پر ایک وردی پوش گارڈ گہری نیند سو رہا تھا۔ سباطی کہنے لگا:

''اگرچہ گارڈ سو رہا ہے مگر یہاں کوئی آدمی کھجوریں نہیں توڑتا۔ تم نے کسی کو پھل کے علاوہ یہاں چھوٹا سا پھول توڑتے ہوئے بھی نہیں دیکھا ہوگا۔''

ہم چوکیدار کے قریب سے گذرے تو شاید وہ ہمارے قدموں کی آواز سن کر جاگ اُٹھا۔ اس نے لیٹے لیٹے آنکھیں کھول کر ہماری طرف دیکھا اور دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔ سباطی نے ہنس کر مجھے کہا:

''یہ گارڈ سوتے میں بھی جاگ رہے ہوتے ہیں۔ چلو اب الحمرا کی کینٹین میں چل کر کافی پیتے ہیں۔ یہاں ہمیں مراکش کا خاص قہوہ ملے گا۔ یہ قہوہ بھی مور مسلمانوں کی خاص نشانی ہے۔ جو مسلمانوں کی دوسری روایات کی طرح آج بھی یہاں زندہ ہے۔''

الحمرا کی کینٹین، قصر الحمرا کے جنوب مشرقی دروازے کے سامنے سرو کی درختوں کے درمیان تھی۔ چھوٹا سا ماڈرن ریستوران تھا مگر طرز تعمیر خالص اندلسی مسلمانوں کی تھی۔ دروازے کی محراب کو دو سیاہ ستونوں نے اٹھا رکھا تھا۔ محراب کی پیشانی پر ہسپانوی زبان میں کینٹین کا نام لکھا تھا۔ میں نے سباطی سے پوچھا:

''اس کو چاہیے تھا کہ عربی میں زبان میں بھی کینٹین کا نام لکھ دیتا''

سباطی کہنے لگا:

''دوست! عربی تمہیں سارے سپین میں کہیں نظر نہیں آئے گے۔ سقوط ہسپانیہ کے وقت نصرانیوں نے اس ملک میں چن چن کر مسلمانوں کو قتل کر دیا۔ عربی زبان، قرآن پاک اور اسلام کا نام لینے والا ایک شخص بھی زندہ نہ چھوڑا۔ مگر وہ یہ بھول گئے تھے کہ عرب خون خود ایک رگ وپے میں گردش کر رہا ہے۔ انہوں نے عربی زبان کو اور مسلمانوں کو تو یہاں سے نکال دیا ہے مگر عرب ثقافت عرب کلچر، ان کی زبان ان کی حرکات اور ان کے رہن سہن سے ظاہر ہوتی ہے اور عرب خون ان کی سیاہ آنکھوں اور سیاہ بالوں سے ٹپکتا دکھائی دیتا ہے۔ اس سے ان کی کوئی بھی نسل چھٹا کارا حاصل نہیں کر سکے گی۔ آٹھ سو سال تک عرب مسلمانوں نے یہاں حکومت کی ہے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ یہاں کے ایک سکالر نے مجھ سے ایک بار کہا تھا کہ ہم اس بات کو نہ بھی تسلیم کریں جب بھی ہماری زبان، ہماری زبان کا لہجہ، ہمارا میوزک، ہمارے کھانے، ہماری ایک ایک حرکت اس بات کی زندہ گواہی دیتی ہے کہ ہم عرب مسلمانوں کی اولادیں

ہیں۔"

"یہی وہ احساس کمتری ہے جو ہر ہسپانوی عیسائی میں موجود ہے جو اسے ردِعمل کے طور پر مسلمانوں سے نفرت کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ یہ لوگ بظاہر بڑی خندہ پیشانی اور خوش اخلاقی سے مسلمانوں کے ساتھ پیش آتے ہیں مگر ان کی اکثریت ایسی ہے جو مسلمانوں کو خواہ وہ کسی ملک کا ہو، اپنا دشمن نمبر ایک سمجھتی ہے۔"

قصر الحمرا کے جنوب مشرقی دروازے والی ماڈرن کنٹین یا رستوران سیاحوں سے بھرا ہوا تھا۔ قسم قسم کی زبانیں بولی جارہی تھیں۔ فضاء ہر قسم کے تمباکو اور قہوے کی خوشبو سے لبریز تھی۔ چونکہ مجھے اس قسم کی فضاء بہت پسند ہے۔ اس لیے میں خوشی خوشی ایک کونے کی طرف بڑھا۔ سباطی میرے پیچھے تھا۔ میں نے انگریزی میں کہا:

"دوست! یہ کونا خالی ہے۔ یہاں بیٹھتے ہیں۔

کونے میں ایک چھوٹی سی میز پڑی تھی جس پر سبز پتھر کے گلدان میں گلاب کا صرف ایک پھول سجا ہوا تھا۔ ہم نے قہوہ منگوایا۔ سباطی نے کہا:

"یہاں مراکشی قہوے کو مشینوں کے ذریعے گرائنڈ کر کے قہوہ تیار کرتے ہیں۔ ہمارے ملک میں جن لوگوں کے پاس وقت ہوتا ہے، وہ خود قہوے کے بیج لوہے کے چٹو میں کوٹتے ہیں اور پھر انہیں شیرے میں ملاتے ہیں اور بڑی بڑی کیتلیوں میں ابلنے کے لئے رکھ دیتے ہیں۔"

کینٹین کے ہسپانوی بیرے نے جو ایک نوعمر لڑکا تھا۔ قہوے کی چھوٹی چینک اور دو فنجان لاکر ہمارے میز پر رکھ دیئے۔ یہ فنجان چھوٹے چھوٹے تھے۔ سباطی نے ان میں قہوہ ڈالا۔ قہوے کا رنگ سیاہ تھا۔ میں ہلکا سا گھونٹ بھرا۔ قہوہ بے حد تلخ اور میٹھا تھا۔ پہلے میٹھا لگا۔ پھر اس کی کڑواہٹ حلق میں اترتی چلی گئی۔ ہم پر حکومت کرنے والے انگریزوں نے ہمیں چائے کافی

میں کم میٹھا ڈالنے کی عادت ڈال رکھی ہے مگر سپین میں اور خاص طور پر مشرق وسطی کے ممالک میں لوگ قہوے میں بہت زیادہ میٹھا ڈالتے ہیں۔ ایک گورے رنگ کی موٹی عورت ریستوران کے کاؤنٹر کے پیچھے کھڑی قہوے کی چینکیں بھر بھر کر طشتوں میں سجا رہی تھی۔ اس کے کانوں پر سیاہ بالوں کے گچھے لٹک رہے تھے۔ اس نے سفید شلوکے کے اوپر سیاہ واسکٹ پہن رکھی تھی۔ جس کے کناروں پر سفید موتیوں کی جھالر لگی تھی۔ بالوں کی ایکلٹ اس کی پسینے سے بھری ہوئی پیشانی پر جھول رہی تھی۔ اگرچہ ریستوران میں پنکھے چل رہے تھے مگر فضاء میں گرمی اور حبس تھا۔ قہوہ پی کی ہم رستوران سے باہر نکل آئے۔ باہر کی تازہ اور خوشگوار فضا میں آتے ہی ہم نے سکون کا سانس لیا۔

ہم نے دوپہر کا کھانا قصر الحمرا کے بڑے گیٹ کے قریبی ہوٹل میں بیٹھ کر کھایا۔ یہاں ہلکی سطح پر ائیر کنڈیشنر چل رہا تھا اور فضا میں بڑی خوش گوار خنکی تھی۔ کھانا کھانے کے بعد ہم نے سگریٹ سلگا لئے۔ تب سباطی مجھے ان طلسمی کہانیوں کی باتیں بتانے لگا جو غرناطہ میں مور مسلمان بادشاہوں کے زوال کے بعد سے یہاں مشہور چلی آ رہی ہیں۔ اس نے بتایا:

''قصر الحمرا کے جنوب میں ایک پہاڑی غار ہے۔ یہ غار بڑا گہرا اور تاریک ہے جو پہاڑ کو چیرتا ہوا اس کے اندر تک چلا گیا ہے۔ یہاں لوگوں میں مشہور ہے کہ اس غار میں ابی عبداللہ اور اس کے درباری امراء ابھی تک کسی طلسم کی تاثیر سے قید ہیں۔''

میں نے فوراً کہا:

''جس طرح ایوان بنی سراج میں پہرے پر مامور بوڑھے چوکیدار نے بتایا تھا کہ اس نے آدھی رات کو چار مسلمان مور سرداروں کو دیکھا تھا جنہوں نے زرہ بکتر پہن رکھا تھا۔ ہاتھوں میں جڑاؤ خنجر تھے اور وہ بے چینی سے سنگ مرمر کے فرش پر ٹہل رہے تھے۔''

سباطی نے اپنی سیاہ آنکھیں گھماتے ہوئے کہا:

''تم نے اس افسانوی حکایت کو خوب یاد رکھا ہے۔''

میں نے کہا: ''میں خود افسانہ نگار ہوں اور مجھے اس قسم کے افسانوی اسراروں سے محبت ہے۔ میں تو چاہتا ہوں کے آج کی رات بنی سراج کے ایوان میں گذاروں۔ وہاں کسی ستون کے ساتھ چھپ کر بیٹھ جاؤں اور جب آدھی رات کے بعد قدیم زمانے کے چار مسلمان مور سردار وہاں نمودار ہوں تو ان سے جا کر ملاقات کروں۔''

سباطی نے ہلکا سا قہقہہ لگایا:

''تم بڑے دلچسپ نوجوان ہو۔''

پھر میری طرف جھک کر رازدارانہ انداز میں کہنے لگا:

''مگر خدا کے لئے کہیں ایسی حرکت نہ کر بیٹھنا۔ میں اگرچہ اس قسم کے توہمات پر یقین نہیں رکھتا لیکن میرے بھائی کوئی پتہ نہیں، ان میں حقیقت بھی ہو۔ پھر تمہارے ساتھ کوئی غیر خوش گوار واقعہ بھی پیش آ سکتا ہے۔ اس کئے ہرگز ہرگز رات کو ایوان بنی سراج کا رخ نہ کرنا۔ قہوہ اور منگواؤں؟''

میں نے کہا: ''ہاں۔ میں ایک پیالی مزید پینا چاہتا ہوں۔''

سباطی نے اب وہ افسانوی باتیں سنانی شروع کر دیں جو قصر الحمرا کے ساتھ لوگوں نے وابستہ کر رکھی تھیں۔ وہ کہنے لگا:

''کبھی کبھی مجھے ایسے لگتا ہے کہ انسان بنیادی طور پر توہم پرست ہے۔ وہ کتنی بھی ترقی کر جائے اس کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ جس بات کو وہ اپنا واہمہ سمجھ رہا ہے، کاش وہ حقیقت بھی ہو۔ اب تم جدید یورپ کے لوگوں کو لے لو۔ وہاں ہم مشرقی لوگوں کے مقابلے میں لوگ زیادہ

تو م پرست ہیں۔"

میں نے سباطی کی بات کاٹتے ہوئے کہا:

"دوست مجھے الحمرا کے بارے میں جو افسانوی قصے مشہور ہیں۔ وہ سناؤ مجھے یہ افسانوی قصے سننے کا بڑا شوق ہے۔"

میرے سیاح دوست سباطی پر بھی غرناطہ کے پراسرار افسانوں کا کچھ کچھ اثر ہونے لگا تھا۔ وہ کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔ پھر سگریٹ کا کش لگا کر بولا:

"یہ حقیقت ہے کہ اندلس کی سرزمین کے ساتھ ایسے ایسے اسرار وابستہ کر دیئے گئے ہیں کہ جنہیں سن کر آدمی حیران سا ہو کر رہ جاتا ہے اور ان اسرار کو حل کرنے کی خواہش کرتا ہے۔ مثلاً سیرا نوار کی وادی کے ساتھ بھی ایک پراسرار کہانی وابستہ ہے۔ کہتے ہیں کہ اس وادی میں ایک پہاڑی غار ہے جس میں ایک لوہے کی بھاری میز ہے۔ اس میز پر موروں کے زمانے کے کسی سردار کا زرہ بکتر پڑا ہے۔ اس میز کے پاس ہی ایک سحر زدہ بکتر اور گھوڑا کسی مسلمان مورامیر زادے کی ہے جس نے زوال غرناطہ کے بعد اس غار میں آ کر پناہ لی تھی اور وہ یہیں انتقال کر گیا تھا۔ اسکی زرہ بکتر اور گھوڑا تب سے کسی طلسم کی زیرِ اثر غار میں ویسے ہی موجود ہے۔ مراکش کے مسلمانوں میں یہ بات مشہور ہے کہ یہ زرہ بکتر اور گھوڑا کسی مسلمان ہی کے کام آ سکتا ہے۔ لیکن اس کے طلسم کا اثر صبح سے لے کر دوپہر تک ہی رہتا ہے۔ ان اوقات میں اگر کوئی اس غار میں گھس کر زرہ بکتر پہن لے اور گھوڑے پر سوار ہو کر باہر آ جائے تو وہ اپنے طاقتور سے طاقتور دشمن کو مغلوب کر سکتا ہے۔"

میں نے کہا: "کیا آج تک کسی مراکشی مسلمان نے غار میں داخل ہو کر زرہ بکتر اور گھوڑا حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی؟"

سباطی نے کندھے سیکڑتے ہوئے کہا:

''طلسم کے ڈر کے مارے کوئی غار میں گھسنے کی جرات نہیں کرتا۔ ہاں ایک بار تابخیر کے ایک مسلمان نوجوان نے کوشش ضرور کی تھی۔''

سباطی خاموشی ہو گیا وہ سگریٹ کی راکھ جھاڑ رہا تھا میں نے بے تابی سے پوچھا:

''کیا وہ کامیاب ہوا؟''

سباطی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا:

''اس کے دوست نے اسے غار میں جانے سے بہت منع کیا مگر نوجوان اپنی ضد پر اڑ رہا اور تابخیر سے چل کر سیرانوار کے پہاڑی سلسلے میں پہنچا اور خاص غاز میں گھس گیا۔ اس کا دوست باہر ہی رہا۔ اس وقت دن کا ایک بجا تھا اور روائیت کے مطابق غار میں طلسم کا اثر تھا۔ کہتے ہیں کہ تھوڑی ہی دیر بعد غار میں سے انسانی چیخوں کی آوازیں سنائی دیں جو دوست غار کے باہر تھا وہ ڈر کر بھاگا اور سامنے والے ٹیلے پر چڑھ گیا پھر اس نے دیکھا کہ غار میں اس کا دوست اس حالت میں چیختا چلاتا دیوانہ وار ہاتھ مارتا نکلا کہ اس کا سارا جسم شعلوں میں لپٹا ہوا تھا۔''

''کیا وہ نوجوان مر گیا؟'' میں نے سوال کیا۔

''نہیں۔'' سباطی نے ہلکے سے طنزیہ تبسم کے ساتھ کہا۔ ''وہ شعلے اصلی نہیں تھے جادو کے شعلے تھے غار میں سے نکلنے کے چند سیکنڈ کے بعد ہی شعلے غائب ہو گئے اور ضدی نوجوان بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ اس کا دوست دوڑ کر اس کے پاس پہنچا۔ اس نے دیکھا کہ نوجوان کے جسم پر آگ کے شعلوں کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ اس کا ایک بال تک نہیں جلا تھا..... بس یہ افسانوی قصے ہیں۔ لوگوں نے خود اپنی دلچسپی کے لیے اور خود سننے کے لیے گھڑ رکھے ہیں۔''

میں نے مزید دلچسپی کے ساتھ سباطی سے پوچھا:

''تم نے صبح ناشتے پر تین بہنوں کی خانقاہ کا ذکر کیا تھا۔ اس کے بارے میں کچھ بتاؤ۔''

سباطی کہنے لگا،

''سپین پر جب عیسائی حکمرانوں کا قبضہ ہو گیا تو ایک عرصے تک اندلس کے قلعوں اور محلات پر ایک ویرانی سی چھائی رہی۔ غرناطہ کا قصر الحکمر ابھی سوگ کی کیفیت میں ڈوب گیا۔ بنی سراج کے ایوان میں مشرقی فصیل والے شاہی باغ کے کون میں برج الامیرات ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں تین شہزادیاں رہا کرتی تھیں۔ عام طور پر مشہور ہے کہ ان میں سے ایک شہزادی سریۃ کی روح آج بھی ان ایوانوں میں منڈلاتی ہے ایک جرمن سیاح سے یہ روایت مشہور ہے کہ اس نے شہزادی سریۃ کی روح کو برج الامیرات کے باغیچے میں مرمریں فوارے کے قریب بیٹھے دیکھا تھا۔ وہ بربط ہاتھ میں لئے ہوئے تھی اور اداس لے میں اسے بجا رہی تھی۔''

سباطی نے اپنے مخصوص انداز میں اس افسانوی روایت پر بھی تبصرہ کرتے ہوئے یہی کہا کہ یہ سب اوہام پرستی کی باتیں ہیں مگر میرے ذہن میں مرمریں فوارے کے پاس بیٹھ کر بربط بجاتی اداش شہزادی سریۃ کی روح کا تصور جیسے جاگزیں ہو گیا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں اس اداس شہزادی کی روح کو دیکھنے کے لیے رات کو ضرور جاؤں گا۔ میں نے سباطی سے پوچھا:

''شہزادی سریۃ کی روح کیا ہر رات کو برج الامیرات کے باغ میں ظاہر ہوتی ہے؟''

سباطی نے کہا: ''لوگ یہی کہتے ہیں مگر میں اسے نہیں مانتا۔ روح وجود برحق ہے مگر یہ کہ روح آسمانوں سے اتر کر زمین پر اپنے مکان میں چلتی پھرتی ہے یا کسی فوارے کے پاس بیٹھ کر بربط کے نغمے چھیڑتی ہے۔ یہ سب تو ہم پرستی ہے ایسی باتوں میں حقیقت کا ذرا سا بھی دخل نہیں ہوتا۔''

مگر میں جانتا تھا کہ ایسی باتیں حقیقی ہوتی ہیں اور روحیں زمین پر آ کر اپنے پیاروں کو دیکھتی ہیں اور ان کی خوشیوں اور غموں میں شریک ہوتی ہیں۔ اس کے بعد ہم دونوں واپس اپنے ہوسٹل میں آ گئے۔ اس وقت رات کے نو بج رہے تھے ہمارے میزبان نے ہمارے لیے ایک پورٹیبل سائز کا ٹیلی ویژن لا کر کمرے میں کارنس پر رکھ دیا تھا۔ اس وقت ٹیلی ویژن پر ہسپانوی گانے اور ڈانس نشر ہو رہے تھے سیاہ چست کرتیوں اور سرخ فراکوں میں ملبوس ہسپانوی لڑکیاں مجیرے بجاتی ہوئی گٹار کی تال پر زمرار قص کر رہی تھیں۔ یہ رقص سپین کا سب سے مقبول رقص ہے۔ سباطی پلنگ پر نیم دراز بڑی دلچسپی سے رقص کا یہ پروگرام دیکھ رہا تھا۔

میں اپنے پلنگ پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ میں نے رات کے وقت الحمرا کے برج الامیرات میں جا کر اندلسی شہزادی کی اداس روح کو دیکھنے کا پکا ارادہ کر لیا تھا میں یہ وسوچ رہا تھا کہ سباطی کے آگے کون سا بہانہ بناؤں کہ میں اس کے بغیر اکیلا رات کے وق باہر جا سکوں۔ آخر ایک ترکیب میرے ذہن میں آ گئی۔ میں نے سباطی سے کہا:

''دوست! تم ٹیلی ویژن کے پروگرم دیکھو میں اتنی دیر میں غرناطہ کی گلیوں کا چکر لگا کر آتا ہوں۔''

سباطی بولا: ''میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں تم کہیں راستہ نہ بھول جانا۔''

میں نے کہا: ''نہیں دوست! میں کچھ وقت غرناطہ کی پراسرار اور تاریخی گلیوں میں اکیلا بھی گھومنا چاہتا ہوں۔ تم اسے مائینڈ نہ کرنا۔''

سباطی مسکرایا اور بولا:

''تو پھر یونیورسٹی کیمپس کا انٹرسیکشن یاد رکھنا اور دوسری بات یہ ہے کہ زیادہ دور اور ویران علاقے میں نہ جانا۔ یہاں رات کو بڑے جرائم ہوتے ہیں۔''

میں نے جیکٹ کا زپ اوپر چڑھاتے ہوئے کہا: ''تم بے فکر رہو میں تمہاری نصیحت پر پورا پورا عمل کروں گا۔''

سباطی کو ہوسٹل کے کمرے میں چھوڑ کر میں کیمپس کے احاطے سے باہر سڑک کے چوراہے میں نکل آیا۔

غرناطہ کا ماڈرن شہر روشنیوں میں نہا رہا تھا یہ شہر یورپ کے بڑے شہروں کا مقابلہ تو نہیں کرتا تھا مگر پھر بھی اس کی بلند و بالا عمارتیں اور روشنیوں میں جگمگ کرتے سٹور ریستوران اور سڑکیں یورپ کے شہروں جیسی بارونق اور ماڈرن تھیں۔ میں نے ایک بس پکڑی اور بڑے چوک میں آ کر اتر گیا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ سباطی نے میرے ساتھ یہیں سے الحمرا کے لیے ٹورسٹ بس پکڑی تھی۔ اس وقت سٹینڈ پر تین ٹورسٹ بسیں کھڑی تھیں۔ میں نے ایک آدمی سے انگریزی میں پوچھا کہ قصر الحمرا کو بس کس وقت جائے گی۔ وہ ہسپانوی آدمی انگریزی زبان بالکل نہیں جانتی تھا۔ اس نے کندھے سکیڑے اور آگے چل دیا۔

سامنے ایک ڈرگ سٹور تھا۔ میں وہاں چلا آیا۔ کاؤنٹر پر ایک خوبصورت سپینی لڑکی کھڑی اک موٹی عورت کے لیے لفافے میں دوائیوں کا پیکٹ لپیٹ رہی تھی۔ میں خاموشی سے ایک طرف کھڑا ہو گیا جب موٹی عورت کاؤنٹر سے ہٹ گئی تو ہسپانوی لڑکی نے اپنی زبان میں مجھ سے کچھ پوچھا۔ ظاہر ہے یہی پوچھا ہو گا کہ مجھے کیا چاہیے۔ میں نے مسکراتے ہوئے انگریزی میں کہا کہ میں سپینش نہیں جانتا۔ لڑکی نے مسکرا کر ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہا:

''سینور! تمہیں کیا چاہیے؟''

تب میں نے اس سے کہا کہ میں ٹورسٹ ہوں اور ستاروں کی روشنی میں قصر الحمرا کے باغ دیکھنے کی خواہش ہے۔ مجھے بتاؤ کہ ٹورسٹ بس یہاں رات کو کس وقت چلتی ہے۔ لڑکی نے

کہا:

''سی سینور! ٹورسٹ بسیں شام کے بعد الحمرا فورٹ کی طرف نہیں جاتیں۔ ہاں تم اگلے چوک میں جاؤ۔ وہاں تمہیں الحمرا کی پہاڑی کالونی کی طرف جانے والی بس مل جائے گی۔''

''کیا تم مجھے اس کا نمبر بتا سکتی ہو پلیز:''

لڑکی نے معذرت کے انداز میں کہا: ''سوری سینور! مجھے نمبر نہیں معلوم۔ تم وہاں کسی سے پوچھ لینا۔''

میں لڑکی کا شکریہ ادا کرتا ہوا ڈرگ سٹور سے باہر آ گیا۔ اگلے چوک میں ایک چھوٹا سا بس سٹاپ تھا۔ یہاں خوب روشنی ہو رہی تھی وہاں پہلے سے تین چار مسافر کھڑے بس کا انتظار کر رہے تھے میں بڑی مشکل سے بس کے نمبر کا پتہ لگانے میں کامیاب ہو گیا مجھے آج بھی اس بس کا نمبر یاد ہے۔ یہ K- 24 تھا۔ جب اس نمبر کی بس آئی تو میں اس میں سوار ہو گیا۔ بس غرناطہ شہر کے مختلف بازاروں میں سے گذرتی ہوئی اوپر قصر الحمرا کی پہاڑی کی طرف آ گئی۔ یہاں اوپر پہاڑی کی ڈھلان پر بنے ہوئے مکانوں کی روشنیاں بے حد خوبصورت لگ رہی تھیں یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کسی نے پہاڑی پر کھڑے ہو کر زر و جواہر کے صندوق انڈیل دیئے ہیں جو ستاروں کی روشنی میں دمک رہے ہیں۔

بس پہاڑی سڑک کے چکر کاٹتی موڑ گھومتی قصر الحمرا ہسپانوی کالونی کے سٹاپ پر آ کر رک گئی میں یہاں اتر پڑا میری بائیں جانب ذرا بلندی پر قصر الحمرا کی بلند و بالا فصیل تھی جس کی سب سے اونچی محراب پر روشنی ہو رہی تھی فصیل کے بڑے دروازے تک سرو کے درختوں میں گھری ہوئی پتھریلی سڑک جاتی تھی جس کے دونوں جانب کھمبوں پر ٹیوب لائٹس روشن تھیں۔ صبح سباطی کے ساتھ میں اسی سڑک پر سے گذر کر قصر الحمرا میں داخل ہوا تھا۔ اب صرف

ایک مسئلہ باقی تھا کہ رات کو گارڈ مجھے اندر جانے کی اجازت دیں گے؟

میں اسی مسئلے پر غور کرتا قلعے کو جاتی سڑک پر چل پڑا۔ میرے سوا اس سڑک پر مجھے کوئی دوسرا سیاح نظر نہ آیا تو مجھے یقین ہو گیا کہ قصر الحمرا میں کسی نہ کسی طرح ضرور داخل ہونے کی کوشش کروں گا اور ایوان بنی سراج کے برج الامیرات میں اندلس کی شہزادی کی سوگوار روح کو دیکھوں گا۔

مجھے اس بات کا بھی احساس تھا کہ رات کو پہرہ دینے والے گارڈز کی اجازت کے بغیر میں قصر الحمرا میں داخل نہ ہو سکوں گا۔ میں نے ایک بجلی کے کھمبے کے نیچے کھڑے ہو کر اپنا بٹوہ نکال کر اس کا جائزہ لیا۔ میرے پاس پینی کرنسی میں دس دس کے تین نوٹ تھے۔ اور ایک سگریٹ کا پیکٹ تھا جس میں سے میں نے صرف ایک سگریٹ ہی پیا تھا میں نے دس کا ایک نوٹ نکال کر الگ جیب میں رکھ لیا پھر سگریٹ کے پیکٹ میں سے دو سگریٹ نکال کر پیکٹ بھی دس کے نوٹ والی جیب میں رکھ لیا۔ اب میں نے اپنی رفتار تیز کر لی۔ پہاڑی سڑک کا ایک موڑ مڑنے کے بعد میں قصر الحمرا کے بڑے گیٹ کے سامنے نکل آیا میں نے ایک طرف کھڑے ہو کر دیکھا کہ گیٹ کے باہر ایک جانب دو فوکسی ویگن گاڑیاں کھڑی تھیں ساتھ ہی تین موٹر سائیکل بھی کھڑے تھے گیٹ کے پاس ہی چھوٹا سا کیبن تھا جس کے باہر باوردی گارڈ رات کی ڈیوٹی دے رہا تھا۔ وہ سگریٹ پی رہا تھا اور اکیلا ہی بیٹھا تھا۔

فوکسی ویگن گاڑیوں اور موٹر سائیکلوں کو دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ کچھ دوسرے سیاح بھی رات تک وقت الحمرا کو دیکھنے کے لیے اندر جا چکے ہیں اور ظاہر ہے کہ گارڈ نے ان سے رشوت لے کر ہی انہیں اندر جانے کی اجازت دی ہو گی۔

میں نے سگریٹ سلگا لیا اور بڑی بے نیازی سے قدم قدم چلتا ادھر ادھر دیکھتا کیبن کے

قریب چلا گیا۔ ہسپانوی گارڈ نے میری طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا میں نے مسکرا کر اسے ہسپانوی انداز میں سلام کیا اس نے بھی اپنی انگلی گول ٹوپی کے قریب لے جا کر مسکراتے ہوئے سی سینور کہا اور مزے سے سگریٹ کے کش لگانے میں مشغول ہو گیا جان بوجھ کر میں اس کے مزید قریب ہو گیا اور ٹوٹی پھوٹ انگریزی میں اس سے کہا کہ میں ٹورسٹ ہوں اور الحمرا کی رات کے وقت سیر کرنا چاہتا ہوں۔ گارڈ نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''نو سینور نو!''

میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو گارڈ ترچھی نگاہوں سے میری طرف تکنے لگا میں نے دس کا نوٹ اور سگریٹ کا پیکٹ اس کی طرف بڑھایا اور شکستہ انگریزی میں کہا:

''سینور! فار یو پلیز''

گارڈ نے گردن گھما کر اپنے پیچھے ایک نظر ڈالی اور پھر اتنی تیزی سے میرے ہاتھ سے دس کا نوٹ اور سگریٹ کا پیکٹ جھپٹ کر اپنی جیب میں ڈالا کہ میں اس کا منہ ہی تکتا رہ گیا۔ گارڈ نے مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا بڑے پھاٹک کے پہلو میں ایک چھوٹا دروازہ تھا جو بند تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے ذرا سا دبایا تو وہ کھل گیا میں قصر الحمرا کے پھاٹک میں سے اندر چلا گیا مجھے سب معلوم تھا کہ کسی ایوان میں سے گذر کر کسی ایوان میں جانا ہے۔ میری منزل بنی سراج کا ایوان تھا جو دوسرے محرابی دروازے میں سے گذرنے کے بعد آتا تھا قصر الحمرا میں جگہ جگہ لائٹیں لگی تھیں اور سارے ایوان رات کو بھی روشن تھے اندر بھی کہیں کہیں گارڈ منڈلاتے نظر آ رہے تھے میں ان کے قریب سے گذرا تو کسی نے مجھ سے نہ پوچھا کہ میں کس کی اجازت سے اندر آیا ہوں میں سمجھ گزیا کہ جو رشوت میں نے بڑے گیٹ کے گارڈ کو دی ہے اس میں ان چوکیداروں کا بھی حصہ ہے بہر حال میرا مسئلہ حل ہو چکا تھا میں ایوان الاسد میں سے گذرا تو وہاں مجھے کچھ

عورتیں اور مرد دکھائی دیئے جو رات کے وقت تصویریں بنا رہے تھے۔ یہ یقیناً فوکسی ویگن اور موٹر سائیکلوں والے سیاح ہی تھے۔

آخر میں ایوان بنی سراج میں پہنچ گیا۔ یہاں فصیل کی جانب روشنی ہو رہی تھی۔ ایوان کے ستون اور مرمریں نہروں کے کنارے پر اندھیرا چھایا ہوا تھا سباطی نے بتایا تھا کہ بنی سراج کے ایوان میں مشرقی فصیل والے شاہی باغ کے کونے میں برج الامیرات ہے یہیں وہ مرمریں فوارہ ہے جس کے پاس جرمن سیاح نے اندلس کی شہزادی کی روح کو دیکھا تھا میں مرمریں نہر کے کنارے کنارے مشرقی فصیل کی طرف چل پڑا۔ آسمان پر تارے نکلے ہوئے تھے ایک جانب دودھیا کہکشاں چمک رہی تھی۔ الحمرا کے باغات اور ایوانوں پر ہیبت ناک خاموشی طاری تھی ایسے لگ رہا تھا جیسے عرب شہزادوں اور شہزادیوں کی روحیں میرے ساتھ ساتھ چل رہی ہوں رات کی خاموشی میں فضا پر ایک مقدس سکوت طاری تھا۔ فضا خنک تھی اوس گرنے لگی تھی اور فضا نظر نہ آنے والے سرخ اور سیاہ گلابوں کی خوشبوؤں سے معمور تھی۔

سنگ مرمر کی سیڑھیاں اترنے کے بعد میں ایک باغیچے میں آ گیا یہی برج الامیرات کا باغ تھا رات کا اندھیرا باغ میں چاروں طرف پھیلا ہوا تھا فصیل کی جانب کافی فاصلے پر لیمپ پوسٹ کی روشنی کھجور کے درختوں تک ہی محدود تھی یہاں آسمان پر تارے پوری آب و تاب سے چمک رہے تھے ان ستاروں کی دھندلی روشنی میں برج الامیرات کے باغ کے درختوں کے ہیولے نظر آ رہے تھے جیسے ان پر کسی نے طلسم کر رکھا ہو میری آنکھیں اس برج کو تلاش کرنے میں لگی تھیں جہاں مرمریں فوارے کے پاس رات کو اندلسی شہزادی کی روح نمودار ہوتی تھی میں باغ کی سایہ دار روش پر چل پڑا۔ سنگ مرمر کی روش کی دونوں جانب سرو کے درختوں کی قطار تھی جو رات کے دھندلے اندھیرے میں صف بستہ مؤدب غلاموں کی طرح کھڑے تھے۔ سرو کے

درختوں کی قطار ختم ہوئی تو مجھے مہندی کی خوشبو آئی۔

مہندی کے پھولوں کی خوشبہ سے میری حس شامہ پوری طرح شناسا تھی۔اس کی وجہ بھی انجیر کے درختوں والی وجہ ہے یعنی یہ کہ انجیر کے درخت کی طرح سمن آباد میں میرے مکان کے پچھواڑے میں جو باغ ہے اس کے ایک پلاٹ میں مہندی کا درخت لگا ہوا ہے مہندی کا درخت فالسے کے درخت کی طرح سات آٹھ فٹ سے زیادہ اونچا نہیں ہوتا اور جھاڑ کی شکل میں پھیلا ہوتا ہے مارچ اپریل کے دنوں میں مہندی کے درخت پر پھول آتے ہیں اور ان پھولوں کی خوشبو سے ہمارا سمن آباد والا چھوٹا باغ مہکنے لگتا ہے مجھے معلوم ہوتا تھا کہ الحمرا کے باغات میں مہندی کے بھی درخت ہیں مگر ان کی خوشبو مجھے پہلی بار آئی تھی۔

اب میرے سامنے ستاروں کی دھندلی روشنی میں ایک چھوٹا سا باغیچہ تھا جس کے کونے میں ایک برج تاروں کی روشنی میں مصری کے کوزے کی طرح لگ رہا تھا میں سمجھ گیا کہ یہی برج الامیرات ہے میں برج کی دوسری جانب گیا تو باغ میں کھجور کے بلند درختوں کے نیچے ایک فوارہ تھا جو بند تھا اس میں سے پانی نہیں چل رہا تھا یہ ایک گول مرمریں حوض کے وسط میں لگا ہوا تھا مرمریں حوض کو دیکھ کر میرے دل کی دھڑکن ذرا تیز ہوئی کیونکہ یقیناً یہ وہی حوض تھا جہاں افسانوی روایات کے مطابق رات کو شہزادی کی روح آتی تھی۔برج کی ایک جانب مہندی سے لدا ہوا تھا اور ان میں سے بڑی تیز خوشبو نکل رہی تھی۔

میں سوچنے لگا کہ مجھے کسی جگہ چھپ کر شہزادی کی روح کا انتظار کرنا چاہیے۔یہ خیال تھا کہ شاید کسی آدمی کی موجودگی کے باعث روح وہاں ظاہر نہ ہو وہاں چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی باغیچے میں گلاب کے چھوٹے پودے لگے تھے مجھے برج کا خیال آیا کہ کیوں نہ اس برج میں چھپ کر شہزادی کی روح کا انتظار کیا جائے برج میں داخ ہونے کا ایک چھوٹا سا محرابی دروازہ

تھا جس کی دونوں جانب سنگ سیاہ کے نازک ستون تھے میں برج میں داخل ہو گیا برج کی دیواروں پر اندھیرا چھایا ہوا تھا ان دیواروں میں چار باریک سنگ مرمر کی جالیاں لگی تھیں جن میں سے ستاروں بھری رات کی دھندلی روشنی اندر آ رہی تھی میں ایک جالی کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا اس جالی میں سے باہر باغیچے کی کیاریوں میں مرمریں فوارہ نظر آتا تھا میرے لیے روح کا انتظار کرنے کے لیے یہی جگہ موزوں ترین تھی یہاں میں کسی کو دکھائی بھی نہیں دیتا تھا میں جالیوں کے پاس ہی بیٹھ گیا تھوڑی دیر بعد میں اٹھ کر سنگ مرمر کی باریک جھلمنیوں میں سے جھانک کر باغیچے میں دیکھ لیتا تھا رات سکوت اور گہری خاموشی کے ساتھ جیسے ایک جگہ رک گئی تھی لگتا تھا کہ الحمرا کے ان باغوں میں آدمی گذرتے ہیں وقت نہیں گذرتا جیسے سقوط غرناطہ کے ساتھ ہی وقت یہاں تھم گیا تھا۔

میں نے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کو دیکھا گھڑی کی چمکدار سوئیوں نے مجھے بتایا کہ رات کے ساڑھے دس بجنے والے ہیں میرا دل سگریٹ پینے کو چاہ رہا تھا مگر نہ جانے کیوں الحمرا کے ماحول اور فضاؤں میں مجھے ایک تقدس محسوس ہونے لگا تھا اور میں نے خواہش کے باوجود سگریٹ نہ سلگایا۔ اس ماحول میں سگریٹ پینا میرے نزدیک بے ادبی تھی وہاں بیٹھے بیٹھے مجھے ایک گھنٹہ گذر گیا۔ اس دوران مجھے بار بار اٹھ کر سنگ مرمر کی جالیوں میں سے مرمریں فوارے کو دیکھنا پڑتا تھا۔ کیونکہ میں بیٹھ کر جالیوں میں سے باہر نہیں دیکھ سکتا تھا سنگ مرمر کی جالیاں برج الامیرات کے سنگین فرش کے پانچ ساڑھے پانچ فٹ اونچی تھیں۔ میں نے سوچا کیوں نہ برج کے دروازے میں ستون کے پیچھے بیٹھا جائے۔ وہاں سے مجھے باغیچے کا مرمریں فوارہ بھی صاف نظر آئے گا۔

اس خیال کے آتے ہی میں اٹھ کر برج کے چھوٹے سے محرابی دروازے میں ایک

ستون کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گیا شبنمی ہوا میں خنکی بڑھتی جا رہی تھی جیسے جیسے رات گہری ہو رہی تھی سردی بھی بڑھ رہی تھی میری گرم جیکٹ مجھے اس سردی سے بچائے ہوئے تھی میں دونوں ہاتھ جیکٹ کی جیبوں میں دیئے جیکٹ کا زپ تھوڑی تک بند کئے ستون کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھا تھا میرا منہ باغ کے فوارے کی طرف تھا۔

اچانک میرے کانوں میں ایسی آواز آئی جیسے کوئی خشک پتوں پر پیر دبا دبا کر چل رہا ہوں ایک بار تو میرے رونگٹے کھڑے ہوئے حقیقت یہ تھی الحمرا کی ساری فضا پر مجھے ایک سحر زدگی کا احساس ہوا تھا جیسے قصر الحمرا کے سارے ایوانوں یہاں تک کہ قلعے کی فصیل پر بھی کسی نے جادو کر رکھا ہو میں نے جلدی سے گردن گھما کر باغ کی پتھریلی روش کی طرف دیکھا اس روش کی دونوں جانب سرو کے درخت تھے روش ستاروں کی روشنی میں دور تک خالی اور ویران پڑی تھی وہاں کوئی سوکھا پتا بھی نہیں تھا کہ جس پر پاؤں رکھنے سے آواز پیدا ہوتی۔

میں نے اس آواز کو اپنا وہم تصور کیا اور ستون کے ساتھ دوبارہ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اس دوران میں تھوڑے تھوڑے وقفے سے باغیچے کے کونے میں بنے ہوئے مرمریں فوارے والے حوض کی طرف دیکھ لیتا تھا۔

وہاں کسی روح کا ابھی تک نام ونشان تک نہ تھا دل میں یہ خیال بھی آیا کہ میں بھی کیسا بے وقوف ہوں محض ایک فرضی کہانی کو سن کر یہاں روح سے ملاقات کرنے آ گیا ہوں مجھے کون عقل مند کہے گا۔ اس قسم کے توہمات تو پرانے زمانے کے قلعوں اور محلات اور حویلیوں کے بارے میں مشہور ہو ہی جاتی ہیں بلکہ مشہور کر دی جاتی ہیں جب گھڑی نے رات کے ساڑھے گیارہ بجائے اور میں وہاں بیٹھے بیٹھے تھک گیا تو میں نے اپنے آپ سے کہا: ''بھائی اب خاموشی سے بوریا بستر لپیٹو اور واپس ہوسٹل چلو۔ کب تک اپنے آپ کو بے وقوف بناؤ گے۔''

میں اٹھنے ہی لگا تھا کہ وہی خشک پتوں کی سرسراہٹ پھر سنائی دی میں جہاں بیٹھا تھا وہیں جیسے پتھر ہو گیا میں نے سرسراہٹ کی آواز پر کان لگا دیئے یہ آواز پتوں کی سرسراہٹ کی نہیں تھی بلکہ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی پتھر کے فرش پر اپنے ایک پاؤں کو گھسیٹ گھسیٹ کر چل رہا ہو اور یہ آواز برج کے اندر سے آ رہی تھی میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اپنے اندر ہمت پیدا کی اور دل میں کہا کہ میاں اگر روحوں کو دیکھنے آئے ہو تو ان کے دیکھنے کا دل میں حوصلہ بھی پیدا کرو۔ ہو سکتا ہے تم ایسے اسرار کا مشاہدہ کرو کہ جو تم نے پہلے کبھی نہ دیکھے ہوں۔

چنانچہ میں نے دل میں کلمہ شریف پڑھا اور اٹھ کر برج کے ان کے دیکھنے کا دل میں حوصلہ بھی پیدا کرو ہو سکتا ہے تم ایسے اسرار کا مشاہدہ کرو کہ جو تم نے پہلے کبھی نہ دیکھے ہوں۔

چنانچہ میں نے دل میں کلمہ شریف پڑھا اور اٹھ کر برجکے اندر آ گیا برج می ویسے ہی تاریکی تھی صرف سنگ مرمر کی باریک جالیوں میں رات کی نیلی نیلی دھندسی اندر آ کر برج کے ماحول کی تاریکی کو دور کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی کچھ تو میری آنکھیں ویسے بھی اب اندھیرے میں دیکھنے کی عادی ہو چکی تھیں اور کچھ میں بھی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ برج میں مجھے کوئی شے نظر نہ آئی۔ سرسراہٹ کی آواز بھی میرے اندر آنے کے ساتھ ہی رک گئی تھی مجھے خیال آیا کہ ہو سکتا ہے اندلسی شہزادی کی روح اسی برج میں رہتی ہو اور یہیں سے نکل کر وہ باغ والے فوارے پر جاتی ہو اور روح میری موجودگی کی وجہ سے باہر نکلتے ہوئے ہچکچا رہی ہو۔ میں نے سوچا کہ مجھے برج سے نکل جانا چاہیے۔

میں اسی خیال کے ساتھ ہی برج کے محرابی دروازے کے طرف بڑھا میں نے ابھی قدم اٹھایا ہی تھا کہ پیچھے سے کسی کی خشک مگر بھاری مردانہ آواز نے میرے قدم وہیں جکڑ دیئے میرا دل تیزی سے دھک دھک کرنے لگا جتنی ہمت میں نے جمع کی تھی وہ ساری ختم ہو گئی اور

مجھے محسوس ہوا کہ اگر میں نے اپنے آپ کو نہ سنبھالا تو میں گر پڑوں گا۔

''تم پر اللہ کی رحمت ہو۔''

یہ الفاظ عربی میں السلام علیکم کے جملے میں کسی نے ادا کئے اور اس جملے کی گونج سارے برج میں پھیل گئی السلام علیکم کے الفاظ نے میرے ڈر و خوف کو کافی حد تک دور کر دیا اور میں نے پلٹ کر برج کے جنوبی خم کی طرف دیکھا وہاں مجھے تاریکی میں ایک انسان ہیولا دکھائی دیا جس کے جسم میں سے کہرے کی طرح کی دھیمی دھیمی کافوری روشنی سی نکل رہی تھی میں نے غور سے دیکھا تو احساس ہوا کہ وہ کوئی حبشی سپاہی ہے جس نے قدیم زمانے کے سرداروں کی طرح زرہ بکتر پہن رکھی ہے ایک ہاتھ میں خم دار اسلامی طرز کی تلوار اور دسورے ہاتھ میں نیزہ ہے اس کے سر پر خود نہیں تھا اس حبشی سردار کی آنکھوں میں سے نیلی روشنی کی ہلکی ہلکی کرنیں وقفے وقفے سے پھوٹ رہی تھیں میں اپنی جگہ پر ساکت کھڑا اس غیر مرئی ہیولے کو دیکھ رہا تھا جس کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ یہ غرناطہ کے کسی سلطانی فوج کے سردار کی روح ہے۔ یہ یقین کر لینے کے بعد کہ یہ ایک مسلمان سپاہی کی روح ہے جو گم شدہ ماضی کے فردوس بریں میں سے نکل کر یہاں آئی ہے میرے اندر مزید حوصلہ پیدا ہو گیا تھا۔

میں نے وعلیکم السلام کہا۔ میرے ہونٹ ابھی تک خشک تھے اور آواز بھی خشک تھی یہ قدرتی خوٹ تھا جسے دور کرنا میرے بس میں نہیں تھا حبشی سردار کی زرہ پوش روح نے اپنا رخ بدلا اب اس کا چہرہ برج کی مشرقی دیوار کی طرف ہو گیا تھا اس نے چند قدم آگے بڑھائے میں نے دیکھا کہ وہ ایک پاؤں کو تھوڑا سا گھسیٹ کر چل رہا تھا میں نے بڑا حوصلہ کر کے اردو میں کہا:

''میں پاکستان سے الحمرا کے قصر دیکھنے آیا ہوں میں مسلمان ہوں۔''

حبشی سردار نے اپنا چہرہ دوبارہ میری طرف کر لیا اور نیزے کی ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا پھر

اس نے بھی اردو زبان میں مجھ سے بڑے دھیمے اور پراسرار لہجے میں کہا:

''میں جانتا ہوں تم کون ہو اور یہاں کیا مقصد لے کر آئے ہو تم شہزادی سریۃ کی روح کا انتظار کر رہے ہو۔''

مجھے یوں خفت سی محسوس ہوئی جیسے میری چوری پکڑی گئی ہو میں نے معذرت کے انداز میں کہا:

''آپ اگر میرے دل کا حال جان گئے ہوں تو آپ کو یہ بھی معلوم ہو گیا ہو گا کہ میں شہزادی صاحبہ کی روح کی زیارت کرنے کی خواہش رکھتا ہوں کیونکہ مجھے سلاطین اندلس سے محبت ہے اور میں ان کے عہد کو اسلام کے زریں ادوار میں شمار کرتا ہوں۔''

حبشی سردار کی روح نے چند لمحے توقف کرنے کے بعد کہا:

''میرے دوست! اندلس کے تمام شاہی محلات اور قلعوں پر طلسم افسوس پھیلا ہوا ہے یہاں کے ویرانوں باغوں پرانی حویلیوں کھنڈروں غاروں اور قدیم قلعوں کے گنبدوں میں ہر جگہ سحر کی فسوں کاریاں رات کو اپنی شکلیں دکھاتی ہیں یہ کفار اور عیسائی جادوگروں کی وجہ سے سب کچھ ہوا ہے مسلمان بادشاہوں کے خفیہ دفینوں کی تلاش میں طلسم پھونک کر خزانے کا سرخ لگانے کی کوشش کرتے رہے ہیں مسلمانوں کی روحیں کبھی کبھار یہاں آتی ہیں اور اپنے گذرے ہوئے درخشاں ماضی کے نشانوں پر آنسو بہا کر واپس چلی جاتی ہیں شہزادی سریۃ کی روح بھی انہیں میں سے ہے۔''

میں نے بے ساختہ سوال کر دیا.....

''محترم! کیا میں شہزادی صاحبہ کی روح سے بات کر سکتا ہوں؟''

''شہزادی صاحبہ کی روح سے بات کرنا گستاخی ہے میں تمہیں اس گستاخی کی ہرگز

اجازت نہیں دوں گا۔"

حبشی سردار کی روح کی آواز اتنی بلند ہوئی کہ برج اس آواز سے گونج اٹھا میں ڈر گیا کہ کہیں یہ روح مجھے اٹھا کر الحمرا کی فصیل سے باہر نہ پھینک دے میں نے سن رکھا تھا کہ روح میں اتنی زبردست طاقت ہوتی ہے کہ وہ بڑی سے بڑی عمارت کو زمین سے اکھاڑ کر پھینک سکتی ہے میں نے بڑے ادب سے پوچھا:

"اے محترم سردار! مجھے اتنی اجازت دیں کہ میں شہزادی صاحبہ کی روح کی صرف ایک نظر دور سے ہی دیکھ سکوں۔"

حبشی سرادر کی روح نے اپنی تلوار اوپر اٹھا کر لہرائی اور درشت آواز میں کہا:

"نہیں میں تمہیں اس کی بھی اجازت نہیں دوں گا۔ میں شہزادی صاحبہ کے محافظ دستے کا سردار ہوں۔ میں یہاں ان کی حفاظت پر مامور تھا اور آج بھی سینکڑوں برس گذر جانے کے بعد اپنا فرض ادا کرنے ہر رات یہاں آتا ہوں تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ تم یہاں سے واپس چلے جاؤ اگر تم مسلمان نہ ہوتے تو اب تک میں تمہیں یہاں سے اٹھا کر غرناطہ کی گلیوں میں پھینک چکا ہوتا۔"

سردار کی روح نے برج کے محرابی دروازے کی طرف تلوار سے اشارہ کرتے ہوئے کہا،

"یہاں سے نکل جاؤ۔"

میں چپکے سے بھیگی بلی کی طرح برج میں سے باہر نکل آیا باہر آتے ہی میری نگاہ مرمریں فوارے یک طرف گئی وہاں ابھی تک کوئی روح نہیں آئی تھی میں باغیچے کی کیاریوں میں سے گذر کر رات کے اندھیرے میں کھڑے سرو کے درختوں کے ایک جھنڈ میں آ کر رک گیا میرا دل

واپس جانے کو تیار نہیں تھا کوئی آواز میرے اندر سے مجھے کہہ رہی تھی کہ تمہاری نیت نیک ہے تم محض عقیدت اور محبت کی وجہ سے یہاں آئے ہو اور اندلس فردوس گم گشتہ کی ایک پاکیزہ شہزادی کی روح کی زیارت کرنا چاہتے ہو یہ ایک نیک خواہش ہے پھر تم کیوں ڈر رہے ہو؟ اللہ پر بھروسہ رکھو اور کسی جگہ چھپ کر شہزادی کی روح کا انتظار کرو باقی جو ہو گا وہ خدا پر چھوڑ دو۔''

رات کا وقت تھا باغیچے میں اندھیرا تھا میں اس اندھیرے میں کسی بھی جگہ چھپ سکتا تھا خطرہ اگر تھا تو صرف اس بات کا کہیں حبشی سردار کی محافظ روح برج سے نکل کر مجھ پر حملہ نہ کر دے۔ میں نے یہ خطرہ قبول کر لیا تھا روحوں سے پہلے بھی میں ڈرا نہیں کرتا تھا ہاں کوئی بدروح نہ ہو بدروحیں انسانوں کو صرف ڈراتی ہی نہیں بلکہ انہیں نقصان بھی پہنچا سکتی ہیں۔ بدروحیں عام طور پر غیر مسلم بدکار لوگوں کی ہوتی ہیں اگر انسان کا ایمان مضبوط ہو تو بری سے بری بدروح بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی نیک روحیں اول تو زمین پر بہت کم اترتی ہیں اگر کسی وجہ سے وہ دنیا کے ماحول میں آ بھی جائیں تو اپنے ساتھ سکون اور مسرت کی خوشبوئیں لاتی ہیں اس کا مجھے تجربہ ہو چکا ہے میں سرو کے درختوں میں ایک ایسی جگہ بیٹھ گیا جہاں سے مجھے برج الامیرات کے پہلو میں مرمریں فوارے کا حوض صاف نظر آ رہا تھا۔

اس وقت رات آدھی گذر چکی تھی آسمان پر سات سہیلیوں کی ٹولی والے ستارے پوری شان سے چمک رہے تھے باغ میں اگرچہ اندھیرا تھا مگر اب میری آنکھیں اس اندھیرے میں ہر شے کو دیکھ سکتی تھیں میری نگاہیں مرمریں فوارے کی طرف لگی تھیں شہزادی کی روح کسی بھی وقت نمودار ہو سکتی تھیں بشرطیکہ جرمن سیاح کا بیان حقیقت پر مبنی ہو میرا دل کہتا تھا کہ روح ضرور آئے گی اور اب تو حبشی سردار کی روح بھی اگر دیکھا جائے تو ایک طرح سے میرا وہم ہو سکتا تھا مجھے غالب کا مصرعہ یاد آنے لگا......

عالم تمام حلقہ دام خیال ہے

مگر نہیں یہ سارے عالم اللہ تبارک وتعالے نے یونہی نہیں پیدا کئے ان کی ایک حتمی حیثیت ہے ان کی ایک منزل متعین کی گئی ہے اور یہ ایک بہت بڑی حقیقت ہے اور یہ سارے عالم ایک اعلی اور ارقع منزل کی طرف گامزن ہیں۔ میں ان خیالوں میں محو تھا مگر میری نظریں فوارے طرف لگی ہوئی تھیں۔ اچانک مجھے ہلکی سی روشنی کی لہر نظر آئی۔ ایسے نظر آیا جیسے دور بہت دور بجلی کی دھیمی سی چمک ابھر کر غائب ہوگئی ہو۔ میں چوکس ہوگیا ضرور یہ اندلس کی شہزادی سریۃ کی روح کی آمد کا اشارہ تھا مجھے بھیگی ہوئی اندھیری رات کی فضا میں ایک ایسی خوشبو محسوس ہوئی جو میرے لیے بالکل انوکھی خوشبو تھی۔ اس خوشبو کی ایک لہر سی میرے قریب سے ہو کر گذر گئی میں غور سے فوارے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اچانک کہکشاں کی طرف کا ایک سفید نورانی ہیولا برج کے محرابی ستوں کے عقب میں نمودار ہوا اور آہستہ آہستہ حرکت کرتا ہوا مرمریں فوارے کے پاس آ کر رک گیا یہ ہیولا انسانی شکل کا تھا اور اس کے سارے جسم میں ایسی چمک تھی جیسے رات کو کہکشاں میں ہوتی ہے یہ شہزادی کی روح کے سوا اور کوئی نہیں تھا مرمریں فوارہ مجھ سے پچاس ساٹھ گز کے فاصلے پر تھا اس لیے مجھے روح کی شکل اور اس کے ہاتھ میں جو بربط تھا وہ صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا میں سرو کے درختوں کے نیچے سے گذر تا زیتون کے چوڑے پتوں والے درختوں کے عقب میں آ گیا میں نے پتوں کو ہٹا کر غور سے دیکھا میں بیان نہیں کر سکتا کہ وہ کیا نور تھا اور کیسی دھیمی نورانی چمک تھی جو شہزادی کی روح کے کناروں میں سے پھوٹ رہی تھی بہشت کے پھولوں کی خوشبو چاروں طرف پھیل گئی تھی شہزادی کا لباس سفید نورانی تھا جس پر جڑے ہوئے ہیرے ستاروں کی طرح چمک رہے تھے اس کے ہاتھ میں بربط تھا وہ فوارے کے مرمریں پتھر پر بیٹھی تھی اس کا اداس چہرہ

جھکا ہوا تھا اور سنہری بال آبشار کی طرح نیچے گر رہے تھے۔

شہزادی نے بربط اٹھایا اور اس کے تاروں پر اس کی نورانیا نگلیاں چلنے لگیں۔ شہزادی کی روح نے بربط کے ساز پر ایک دردانگیز نغمہ چھیڑ دیا۔ اسکی خزاں نصیب آواز میں اداسی جیسے آہیں بھر رہی تھی۔ نغمے کے الفاظ اور معنی میری سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ مگر میں زیتون کے درختوں کے پیچھے چھپا دم بخود تھا۔ شہزادی کی روح کے نغمے نے مجھ پر غمگین کیفیت طاری کر دی تھی۔ مجھے ایسے لگ رہا تھا جیسے اندس کی آٹھ سو سالہ تاریخ الحمرا کے باغوں اور محلوں میں آہیں بھر رہی ہے۔ اچانک بربط کے تاروں پر شہزادی کے ہاتھ رک گئے۔ میں بھی تک دردناک نغمے کے طلسم میں گم تھا کہ شہزادی کی روح نے اپنی نورانی گردن موڑ کر زیتون کے درختوں کی طرف دیکھا۔ میں ایک دم سے ٹھٹک سا گیا۔ سوچا وہاں سے بھاگ جاؤں مگر میرے پاؤں من من بھاری ہو گئے تھے۔ میں کوشش کے باوجود اپنی جگہ سے نہ ہل سکا۔

اس لمحے برج الامیرات کی جانب سے حبشی سردار کی زرہ پوش روح ایک بگولے کی طرح نکلی اور میرے اوپر آ کر منڈلانے لگی۔ مجھے حبشی سردار کی روح کی قہر بھری آواز سنائی دی۔

''تم اندلس کی شہزادی کی بے ادبی کے مرتکب ہوئے ہو۔ تیزی موت میرے ہاتھوں لکھی تھی''۔

میں اوپر دیکھ رہا تھا۔ حبشی سردار کی روح کے ہاتھ میں لمبا نیزہ تھا۔ اس نے نیزے والا ہاتھ اوپر اٹھایا جیسے مجھ پر حملہ کرنے والا ہو۔ میں نے بھاگنا چاہا مگر زمین نے جیسے میرے پاؤں جکڑ لئے تھے۔ اچانک شہزادی کی روح کا ہاتھ بلند ہوا۔ حبشی سردار کی روح وہیں ساکت ہو گئی۔ اور پھر میری آنکھوں کے سامنے آہستہ آہستہ فضا میں تحلیل ہو گئی۔ خوف کے مارے میرا حلق

خشک ہو رہا تھا۔ شہزادی کی روح میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی نورانی آنکھیں ہیروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ میرے ہونٹوں پر مہر سکوت لگی تھی۔ میں بولنا چاہتا تھا مگر الفاظ میرے حلق میں آ کر اٹک گئے تھے۔ پھر مجھے شہزادی کی روح کی سرگوشیوں ایسی اداس آواز سنائی دی:

''عرب شہسواروں کی تلواریں ٹوٹ گئیں، مسلمان موروں کو آپس کے نفاق نے ہلاک کر دیا۔

تاریخ کا سنہرا قلم ٹوٹ گیا۔

مشرق سے طلوع ہونے والا سورج مشرق میں ہی غروب ہو گیا۔

عرب شہسواروں کی تلواریں ٹوٹ گئیں''۔

میں کچھ نہ سمجھ سکا کہ یہ کوئی دلدوز اشعار تھے یا شہزادی سریتہ کی روح مجھ سے ہمکلام تھی۔ میری قوت گویائی جیسے مجھے واپس مل گئی تھی۔ میرا حلق اب خشک نہیں تھا۔ شاید یہ شہزادی کی سوگوار پرسکون آواز کا اثر تھا۔ میں نے اپنے لہجے میں انتہائی ادب و تعظیم پیدا کرتے ہوئے اردو میں کہا:

''شہزادی صاحبہ کو میرا اسلام۔ میری تعظیم! میں خوش قسمت ہوں کہ مجھے آپ کی روح کی زیارت نصیب ہوئی''۔

چونکہ مجھے اسکا تجربہ ہو چکا تھا کہ روحیں دنیا کی ہر زبان میں بات کر سکتی ہیں۔ اس لئے میں نے اردو زبان میں جملہ ادا کیا تھا۔ سنہری بالوں والا سر جھکا ہوا تھا۔ پھر مجھے وہی سرگوشی نما اداس آواز سنائی دی:

''ہم تمہاری عقیدت کی قدر کرتے ہیں۔ اب تم واپس چلے جاؤ''۔

میں نے ہمت کر کے پوچھا:

''کیا آپ شہزادی سریتہ کی روح ہیں''۔

خاموشی۔۔ خاموش۔۔ میں اپنے اندر اپنا سوال دہرانے کی جرأت نہیں پا رہا تھا۔

روح کی سرگوشی ایک بار پھر فضا میں ابھری۔

''ابی عبداللہ کا تخت خالی پڑا ہے، بنی سراج کے ایوانوں میں خون کے نشان ملتے ہیں۔ جاؤ بنی سراج کے ایوان خاص میں جاؤ، تم جس کی تلاش میں ہو، وہ تمہیں وہیں میسر آئے گی''۔

سرگوشی فضا میں تحلیل ہوگئی۔ الحمرا کی بھیگتی رات میں گہرا سکوت چھا گیا۔ شہزادی کی نورانی روح مرمریں فوارے سے آہستہ سے الگ ہوئی اور جیسے فضا میں تیرتی ہوئی برج الامیرات کے محرابی دروازے میں داخل ہو کر میری نظروں سے غائب ہوگئی۔ بہشت کی وہ پاکیزہ خوشبو بھی معدوم ہوگئی جو نورانی روح اپنے ساتھ لائی تھی۔

ایک خواب تھا جو ٹوٹ گیا تھا۔

ایک بلبل کی درد بھری آواز نے مجھے چونکا دیا۔ نہ جانے آدھی رات کو یہ بلبل کہاں سے آئی تھی جو سرو کے کسی درخت میں چھپی اداس لے میں بول رہی تھی۔ میں زیتون کے درختوں سے نکل آیا۔ الحمرا کا باغ، سرو کے درختوں والی روشیں، اس کی کیاریوں میں کھلے ہوئے سرخ و سیاہ گلاب۔ سبھی جیسے دم بخود تھے۔ ہمہ تن گوش تھے۔ جیسے شہزادی کی روح کی، اندلس کی روح کی وہی غم زدہ آواز پھر سننا چاہتے ہوں۔

میں برج الامیرات کے ایوان سے نکل کر بنی سراج کے ایوان کی طرف جا رہا تھا کہ نیم روشن راہ داری کے آخر میں اچانک الحمرا کے گارڈ نے میرا راستہ روک لیا۔

''کسی سیاح کو آدھی رات کے بعد یہاں ٹھہرنے کی اجازت نہیں ہے''۔

اس نے شکستہ انگریزی میں کہا۔ میں نے ویسی ہی انگریزی میں کہا:

''میں باقی کی رات بنی سراج کے ایوان میں بسر کرنا چاہتا ہوں۔ میں بڑے دور دراز کے ملک سے قصر الحمرا کی زیارت کو آیا ہوں''۔

یہ گارڈ اونچا لمبا جوان ہسپانوی تھا۔ اس نے میرے بازو کو پکڑ کر مجھے آہستہ سے اپنی طرف کھینچا اور کہا:

''سوری سینور! یہ کام اب تمہیں کل سویرے کرنا ہوگا۔ اس وقت تم اپنے ہوٹل میں جا کر آرام کرو''۔

میں بادل نخواستہ واپس چل پڑا۔

جب واپس ہوسٹل پہنچا تو سباطی نے آنکھیں ملتے ہوئے دروازہ کھولا:

''تم غرناطہ کی گلیوں میں کہاں گم ہو گئے تھے؟ میں تو پولیس سٹیشن رپورٹ کرنے والا تھا''۔

میں نے مسکراتے ہوئے کہا: ''دوست! یہی سمجھ لو کہ میں غرناطہ کی پراسرار گلیوں میں گم ہو گیا تھا۔ بڑی مشکل سے واپس آیا ہوں''۔

میں بوٹ اتار کر اپنے بستر میں گھس گیا۔ اس وقت رات کے تین بج رہے تھے۔ کیونکہ واپسی پر مجھے کوئی بس نہیں ملی تھی۔ ایک ٹرالر والے نے مجھ پر ترس کھا کر مجھے یونیورسٹی کیمپس تک لفٹ دے دی تھی۔ سباطی نے بستر میں لیٹ کر کمبل اوپر کرتے ہوئے کہا:

''سچ سچ بتاؤ تم کہاں تھے؟ کیا کسی نصرانی دوشیزہ کی زلفوں کے جال میں پھنس گئے تھے؟''

میں نے مسکراتے ہوئے کہا:

''نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں تھی''۔

''پھر تم نے اتنی دیر کہاں لگادی؟''

میں سباطی کو شہزادی سریتہ کی روح سے ملاقات کے بارے میں کچھ نہیں بتانا چاہتا تھا۔ مگر نہ جانے کیا بات تھی کہ مجھ سے ضبط نہ ہو سکا اور میں نے اسے ساری داستان بیان کر دی۔ سباطی بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے سرہانے کے نیچے سے پیکٹ نکال کر سگریٹ سلگایا اور میری جانب غور سے دیکھتے ہوئے بولا:

''تم نے جو واقعات بیان کئے ہیں، اگر وہ سچے ہیں اور شہزادی سریتہ کی روح واقعی تمہیں ملی ہے تو تم خوش قسمت ہو کہ زندہ واپس آ گئے ہو۔ اب وہاں ہرگز نہ جانا''۔

میں نے بھی سگریٹ سلگایا کیونکہ بڑی دیر سے میں نے سگریٹ نہیں پیا تھا۔ میں نے کہا:

''دوست! شہزادی کی روح نے تو کوئی ایسی بات نہیں کی جس سے مجھے اپنی جان کی فکر ہو۔ اس کی آمد سے تو مجھے زندگی کے توانا اور گہرے سکون کا احساس ہوا تھا''۔

سباطی آہستہ آہستہ اپنا سر ہلانے لگا۔ جیسے میری بات کو تسلیم کر رہا ہو۔ پھر بولا:

''میں نے کب کہا کہ شہزادی کی روح تمہیں نقصان پہنچائے گی۔ تمہیں اگر خطرہ ہے تو حبشی سردار کی روح سے ہے۔ وہ شہزادی کی روح کا محافظ ہے۔ اس کے پہلے حملے سے تم بچ گئے ہو۔ برج الامیرات میں پھر رات کو گئے تو حبشی سردار کے دوسرے حملے سے زندہ نہ بچو گے''۔

میں خاموشی سے سگریٹ پیتا رہا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ کیونکہ میرا دوبارہ قصر الحمرا میں جانے کا پکا ارادہ تھا۔ اگرچہ اس بار میں بنی سراج کے ایوان میں مسلمان شہنشاہ ابی عبداللہ کے تخت کو رات کے وقت دیکھنا چاہتا تھا۔ ایک تو اس تخت کی طرف شہزادی کی روح نے بھی

اشارہ کیا تھا۔ دوسرے سباطی نے خود مجھے بتایا تھا کہ وہاں رات کے وقت ایسی پر اسرار سرگوشیاں اور زرہ بکتر کی آوازیں سنائی دیتی ہیں جیسے مسلمان سرداروں کی روحیں جمع ہو رہی ہوں۔ میں نے اپنے اس ارادے کے بارے میں سباطی کو کچھ نہ بتایا۔ میں اسے بتانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ میرے اور سباطی کے سوچنے کے انداز اور عقیدے میں بڑا فرق تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر آپ روح کا احترام کرتے ہیں تو روح آپ کا بھی احترام کرے گی اور آپ کو کچھ نہیں کہے گی۔ جبکہ سباطی تشکک پسند طبیعت رکھتا تھا۔ اسے روحوں کے وجود کا یقین بھی تھا لیکن وہ اس بات کو تسلیم نہیں کرتا تھا کہ روحیں عالم بالا سے اتر کر انسانوں سے ملاقات کرتی ہیں۔

''اچھا اب سو جاؤ۔ رات تھوڑی سی باقی رہ گئی ہے۔ میں بھی سوتا ہوں''۔

یہ کہہ کر سباطی نے ٹیبل لیمپ بجھا دیا۔ کمرے میں اندھیرا چھا گیا۔ میں نے سگریٹ پہلے ہی ایش ٹرے میں دبا کر بجھا دیا تھا۔ بتی کے بجھتے ہی میں بھی بستر پر دراز ہو گیا۔ اندھیرے میں مجھے شہزادی سریتہ کی نورانی ہیولے کا عکس نظر آنے لگا۔ مگر یہ میرے تخیل کا کرشمہ تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ سخت تھکا ہوا تھا۔ چند لمحوں کے بعد میں سو چکا تھا۔

اگلے روز میں دیر تک سویا رہا۔ اٹھا تو دن کافی نکل آیا تھا۔ سباطی کمرے میں نہیں تھا۔ کھڑکی کا پردہ ہٹا ہوا تھا اور سنہری دھوپ کی روشنی کمرے میں سنہری غبار کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ میں اٹھ کر غسل خانے میں منہ ہاتھ دھونے چلا گیا۔ اتنے میں سباطی آ گیا۔ اس نے میرا بستر خالی دیکھ کر مجھے آواز دی۔ میں تولئے سے منہ پونچھتا باہر آ گیا۔

''دن کے گیارہ بج رہے ہیں۔ میں نے تو ناشتہ ہوٹل میں کیا ہے۔ صبح ہمارے میزبان کا نوکر ناشتے کے لئے بلانے آیا تھا مگر ہم دونوں سو رہے تھے۔ ایسا کرو تم بھی ہوٹل میں جا کر ناشتہ کر لو۔ میں تب تک یہیں کمرے میں بیٹھتا ہوں''۔

میں نے پوچھا: ''آج کیا پروگرام ہے؟''

سباطی کرسی پر بیٹھ گیا۔۔۔۔

''الحمرا کے ایوان اور باغات کی تو ہم نے خوب سیر کر لی ہے۔ میرا خیال ہے کہ آج غرناطہ شہر کی سیر کر لی جائے اور دوپہر کو دریائے ڈورو کے کنارے کسی ریستوران میں بیٹھ کر مچھلی کباب کھائے جائیں۔ غرناطہ کے مچھلی کباب سارے سپین میں مشہور ہیں''۔

میں بالوں میں کنگھی کر رہا تھا۔ میں نے کہا:

''مگر دوست ریستوران میں تو یہ چیزیں بڑی مہنگی ہوں گی''۔

سباطی بولا:

''تم اس کی فکر نہ کرو۔ میرے پاس اتنے پیسے ہیں کہ میں تین چار دن تمہیں کوئی پیسہ خرچ نہ کرنے دوں''۔

میں نے ہنس کر کہا:

''تین چار دن کے بعد پیسے کہاں سے آئیں گے؟''

سباطی نے کندھے سکیڑتے ہوئے کہا:

''اللہ کوئی نہ کوئی سبب پیدا کر دے گا۔ ویسے میں تو اسی خطہ زمین کا باشندہ ہوں۔ مراکش سپین سے کوئی زیادہ دور واقع نہیں ہے۔ میرے جاننے والے یہاں غرناطہ میں بھی ہیں۔ کسی سے تھوڑی بہت رقم ادھار لے سکتا ہوں''۔

میں سباطی کے خلوص سے بڑا متاثر ہوا۔ میں نے ممنونانہ لہجے میں کہا:

''سباطی دوست! مجھ پر پہلے ہی تمہارے بڑے احسانات ہیں۔ مجھ پر اپنے احسانوں کا اتنا بوجھ نہ ڈالو کہ میں اٹھا نہ سکوں''۔

سباطی نے ہنس کر کہا:

''فارگٹ اٹ دوست! مسلمان تو آپس میں بھائی بھائی ہوتے ہیں۔ اس میں احسان کی کوئی بات نہیں۔ تمہارے پیسے میں اس لئے خرچ نہیں کروانا چاہتا کہ میں تو دو ایک دن میں واپس چلا جاؤں گا۔ مگر تمہیں بطور سیاح ابھی سارے سپین کی سیر کرنی ہے''۔

میرا دل سباطی کے خلوص بھرے احساسات سے لبریز تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنے وطن سے باہر کسی دوسرے ملک میں جب کوئی مسلمان دوسرے مسلمان سے ملتا ہے تو اس وقت احساس ہوتا ہے کہ اسلام کا رشتہ کتنا گہرا اور لازوال ہے۔

میں اور سباطی اس روز غرناطہ کے شہر کی سیر و سیاحت کے ارادے سے ہوسٹل سے نکل پڑے۔ کچھ دیر تک شہر کے پارکوں اور کمرشل سٹرز کے سٹوروں میں گھومتے پھرتے رہے۔ دوپہر کو ایک ریستوران میں خالص ہسپانوی مرچ مصالحے والا کھانا کھایا۔ اس کے بعد ایک سینما ہال میں گھس گئے جہاں ایک ہسپانوی فلم چل رہی تھی۔ امریکی فلموں کی طرح مار دھاڑ سے بھرپور تھی۔ آدھی فلم دیکھ کر ہم سینما ہال سے باہر آ گئے۔

دن ڈوب رہا تھا۔ شہر کی سڑکوں اور بعض اونچی عمارتوں اور غرناطہ کی پہاڑیوں کے نشیب کے مکانوں میں بتیاں جل اٹھی تھیں۔ سڑکوں پر ٹریفک کم ہونے لگی تھی۔ سباطی نے مجھ سے کہا:

''کیا تم نے ''بلڈ اینڈ سینڈ'' فلم دیکھی جس میں ٹائرن پاور نے کام کیا تھا؟''

''ہاں میں نے یہ فلم تین چار بار لاہور میں دیکھی تھی۔ کیوں؟ کیا یہ فلم یہاں لگی ہوئی ہے؟''

سباطی کہنے لگا:

''اگر تم نے وہ فلم دیکھی تھی تو تمہیں یاد ہوگا کہ اس ساری فلم میں تھوڑے تھوڑے وقفے سے گٹار بجائی گئی تھی''۔

''ہاں'' میں نے کہا۔ ''اس گٹار میں اتنا درد تھا کہ لگتا تھا ہسپانیہ کی روح بول رہی ہے''۔

سباطی خوش ہو کر بولا:

''تم واقعی میوزک کا ذوق رکھتے ہو، وہ گٹار سپین کے مایہ ناز گٹار نواز گومیز نے بجائی تھی''۔

''اچھا؟'' میں نے اشتیاق بھرے لہجے میں کہا۔ ''کیا وہ غرناطہ میں رہتا ہے؟ کیا اس سے ملاقات ہو سکتی ہے سباطی؟''

سباطی نے اپنے ماتھے پر آئے ہوئے بال ہاتھ سے پیچھے کرتے ہوئے کہا:

''نہیں۔ وہ آج کل غرناطہ میں نہیں ہے۔ ویسے وہ غرناطہ کا بیٹا ہے۔ یہیں پیدا ہوا، یہیں پلا بڑھا اور یہاں کے ایک ریستوران میں ہی وہ شروع شروع میں گٹار بجا کر گاہکوں کا دل بہلایا کرتا تھا۔ ہم اس وقت اسی ریستوران میں چل کر کافی پیتے ہیں''۔

میرے لئے یہ بڑی خوشی کی بات تھی۔ ''بلڈ اینڈ سینڈ'' فلم سپین کی بل فائٹ پر لکھا گیا ایک بڑا اثر انگیز المیہ ناول تھا جس میں ٹائرن پاور نے ہسپانوی بل فائٹر کا رول ادا کیا تھا۔ یہ ناول ارنسمٹ ہیمنگ وے کا تھا۔

لاہور کے ریگل یا شاندار پلازا سینما میں یہ فلم لگی تھی۔ اس فلم میں سپین کی تہذیب و ثقافت کی بھرپور عکاسی کی گئی تھی۔ اس فلم میں سپین کی تہذیب و ثقافت کی بھرپور عکاسی کی گئی تھی۔ سپین کے سب سے مقبول اور بہادرانہ کھیل بل فائٹ پر اس سے بہتر ناول اور اس سے

بہتر فلم اس زمانے تک ابھی نہیں بنی تھی۔

سباطی نے ایک بس پکڑی اور ہم بارونق روشن بازاروں اور شاہراہوں سے گزرتے ہوئے ایک بازار کی نکڑ پر اتر گئے۔ یہاں سے ایک چھوٹی سی سڑک بائیں طرف گھوم گئی تھی۔ سڑک کے کونے پر ایک ریستوران کا بورڈ لگا تھا جس پر صرف گھوم گئی تھی۔ سڑک کے کونے پر ایک ریستوران کا بورڈ لگا تھا جس پر صرف ''گومیز'' لکھا تھا۔ سباطی نے ریستوران کی طرف اشارہ کر کے کہا:

''یہ گومیز ریستوران ہے۔ اس کے مالک نے اس کا نام ہی گومیز ریستوران رکھ دیا ہے۔ یہاں سپین کا نامور گٹار نواز گومیز شام سے رات گئے تک گٹار بھی بجاتا تھا اور زمرا رقص بھی کیا کرتا تھا۔ زمرا سپین کا مشہور رقص ہے، مرد اور عورتیں مل کر ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر اور کبھی ہاتھ چھوڑ کر ایڑیوں اور پنجوں کے بل تھرک تھرک کر کرتے ہیں۔ ان کے ساتھ صرف ایک گٹار جھنجھنا رہی ہوتی ہے۔ آؤ ریستوران میں چل کر دیکھتے ہیں۔ شاید وہاں پر رقص دیکھنے کو مل جائے''۔

ویسے یہ زمرا رقص میں نے امریکہ کی سپین اور میکسیکو کے بارے میں بنی ہوئی کتنی ہی فلموں میں دیکھا ہوا تھا۔ بلڈ اینڈ سینڈ فلم میں تو یہ رقص خاص طور پر بڑے اہتمام سے دکھایا گیا تھا۔ مگر ابھی تک غرناطہ کے کسی ہوٹل میں یہ رقص دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔

گومیز ریستوران کہنے کو تو ریستوران تھا مگر ہمارے لاہور، اسلام آباد اور کراچی کے ریستورانوں سے بڑا مختلف تھا۔ اس کا ہال کشادہ تھا اور درمیان میں نیم دائرے کی شکل میں ایک سٹیج بنا ہوا تھا جہاں چار پانچ ہسپانوی سازندے بیٹھے گٹار اور وائلن بجا کر لوگوں کا دل محظوظ کر رہے تھے۔ ہال میں بڑی روشنی تھی۔ دیواروں پر غرناطہ کے باغات اور محلات کی محرابیں نقش کی

گئی تھیں۔ایک دیوار پر کسی مسیحی خانقاہ کی تصویر بنی تھی جہاں ایک فرشتے کو سیاہ بادلوں میں سے آسمان کی طرف پرواز کرتے دکھایا گیا تھا۔ ریستوران کی فضا تمباکو، کافی اور وائن کی بو اور عورتوں، مردوں نے جو پرفیوم لگائے ہوئے تھے، ان کی خوشبو سے بوجھل ہو رہی تھی۔ جگہ جگہ زرد اور سرخ رنگ کی چھوٹی چھوٹی گول میزیں لگی تھیں جن کے گرد بیٹھے ہوئے ہسپانوی مرد اور عورتیں کافی اور وائن پی رہے تھے اور سنیکس کھا رہے تھے۔

میں اور سباطی بھی ایک میز کے گرد جا کر بیٹھ گئے۔ فضا ہلکی ہلکی سپینش میوزک سے گونج رہی تھی۔ ہم نے کافی منگوالی۔ جہاں ہم بیٹھے تھے، اس کے ساتھ والی دیوار پر ایک بہت بڑی رنگین تصویر لگی تھی۔ یہ تصویر کسی نوجوان ہسپانوی کی تھی جس کو والہانہ انداز میں سر کو ایک طرف جھکائے گٹار بجاتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔

سباطی نے اس تصویر کی طرف اشارہ کیا اور کہا:

''یہ وسنتو گومیز کی تصویر ہے۔ اسکا پورا نام وسنتو گومیز تھا۔ میں جب بھی مراکش سے چھٹیوں پر غرناطہ آتا ہوں تو اس ریستوران میں اس تصویر کے پاس بیٹھ کر کافی ضرور پیتا ہوں۔ وسنتو گومیز کی گٹار کے نغموں سے ہسپانوی دیوانہ وار محبت کرتے ہیں''۔

اتنے میں ایک ہسپانوی دوشیزہ اور ایک ہسپانوی نوجوان سٹیج پر آئے۔ انہوں نے تالیوں کی گونج میں جھک کر تعظیم کی اور پھر ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر بالکل ساکت ہو کر کھڑے ہو گئے۔ ایک آدمی نے آ کر ہسپانوی زبان میں کچھ اعلان کیا۔

سباطی نے مجھے بتایا: ''یہ شخص اعلان کر رہا ہے کہ سینور سینچا میز اور سینوریتا بلانونا اب گومیز کی مشہور دھن پر زمرا رقص پیش کریں گے۔ مجھے بڑی خوشی ہو رہی ہے کہ ہمیں گومیز کی دھن پر زمرا رقص دیکھنے کا موقع مل گیا''۔

ہسپانوی دوشیزہ اور اس کا ساتھی، دونوں سپین کے روائتی ڈانسروں کے لباس میں تھے۔ اعلان کے ختم ہوتے ہی سپیکروں پر گٹار کی زبردست جھنکار بلند ہوئی اور رقص کرنے والے جوڑے کے جسم بجلی کی طرح تڑپ کر متحرک ہو گئے۔ سارا ہال ایک بار پھر تالیوں اور اولے اولے کی آوازوں سے گونج اٹھا۔

ہسپانوی جوڑے کے رقص نے مجھے محسور کر دیا۔ ان کے چہرے بجلی کی روشنیوں میں شعلوں کی طرح چمک رہے تھے۔ وہ کبھی ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر پنجوں کے بل تھرکتے ہوئے گول چکر لگاتے۔ پھر اچانک ہاتھ چھوڑ کر اپنے اپنے گرد تیزی سے گھوم جاتے اور الگ الگ رقص کرتے تھرکتے دوبارہ ایک دوسرے کے قریب آ کر ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیتے اور کبھی ایک دم ہاتھ جھٹک کر تالی بجاتے ہوئے گٹار کی گت پر جھوم جھوم کر دیوانہ وار رقص کرنے لگتے۔

ہال میں بیٹھے ہوئے لوگ بڑے جوش میں آ کر اولے اولے کے نعرے لگا رہے تھے۔ ایک نوجوان جوڑا اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا اور اٹھ کر میزوں کے گرد رقص کرنے لگا۔ سباطی نے میری طرف جھک کر کہا:

''میوزک سے اس قوم کو عشق ہے۔ یہ عشق ان لوگوں کو عربوں کے خون سے ملا ہے، ان کی موسیقی ان کے رقص ہمارے عرب مسلمانوں کی ودیعت ہیں۔ یورپ میں موسیقی کے جو نقاد ہیں، ان کا کہنا ہے کہ سپین کی موسیقی میں ہمیں جو آگ نظر آتی ہے، یہ عربوں کی لگائی ہوئی ہے۔ میرا خیال ہے، وہ ٹھیک کہتے ہیں''۔

ہسپانوی دوشیزہ اپنے ساتھی رقاص کے ساتھ دیوانہ وار رقص کر رہی تھی۔ وسنتو گومیز کی گٹار کی شباب انگیز دھن نے ایک قیامت برپا کر دی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے طوفانی

سمندر کی کف اڑاتی موجیں ساحلی چٹانوں سے سر ٹکرا رہی ہیں۔ پھر ایک دم سے گٹار کی تیز دھن رک گئی اور وائلن کے سر جیسے سمندر کی گہرائیوں سے جل پریوں کی طرح نکل نکل کر چاندی ایسی لہروں پر تیرنے لگے۔ رقص کرتے جوڑے نے سر پیچھے ڈال دیئے اور پنجوں کے بل تھرک تھرک کر بڑی نپی تلی رفتار سے پیچھے ہٹتے چلے گئے۔ سٹیج کے کنارے پر پہنچ کر انہوں نے دائرے میں ایک چکر لگا کر جھک کر لوگوں کا شکریہ ادا کیا اور ہاتھ میں ہاتھ ڈالے سٹیج سے اتر کر چلے گئے۔

ریستوران کا ہال دیر تک تالیوں سے گونجتا رہا۔ سباطی بھی پر جوش انداز میں تالی بجا رہا تھا۔ اس کے گہرے سانولے مراکشی چہرے پر ایک چمک سی آ گئی تھی۔ ہال میں ایک بار پھر روائتی میوزک بجنے لگا۔

''کیوں۔ کیا خیال ہے؟'' سباطی نے مجھ سے پوچھا۔

میں ابھی تک ہسپانوی رقص اور وسنتو گومیز کی موسیقی کے سحر میں تھا۔ میں نے بڑی گرم جوشی سے سباطی کا ہاتھ دبا کر کہا:

''سباطی! میرے دوست! آج مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میں نے پہلی بار سپینش میوزک سنا ہے اور زمرا رقص دیکھا ہے۔ واقعی گومیز بے مثال موسیقار ہے۔ کیا وہ ابھی زندہ ہے؟''

''ہاں''۔ سباطی نے اپنی پیالی میں ٹھنڈی کافی انڈیلتے ہوئے کہا۔ ''وسنتو گومیز اب کافی بوڑھا ہو گیا ہے۔ وہ میڈرڈ کے ایک عالی شان اپارٹمنٹ میں زندگی کے آخری ایام بسر کر رہا ہے۔ حکومت نے اسے بڑے اعزازات سے نوازا ہے۔ یہ قوم بلکہ تمام زندہ قومیں اپنے فنکاروں کی قدر کرتی ہیں۔ کیا تمہارے پاکستان میں بھی کوئی ایسا موسیقا ہے؟''

میں نے کہا: ''کیوں نہیں، پاکستانی میوزک بھی لازوال روایات کا حامل ہے''۔

سباطی نے پوچھا: ''تمہارے میوزک اور انڈین میوزک میں کیا فرق ہے؟''

میں نے بے ساختہ جواب دیا:

''وہی جو بتوں کی پوجا کرنے اور ایک خدا کو ماننے میں فرق ہے''۔

''میں تمہاری بات پوری طرح سے نہیں سمجھا''۔

میں نے سباطی سے کہا:

''میرے دوست! برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں نے بھی انڈین میوزک کو اپنے خون جگر سے سینچا ہے۔ عربوں نے سپین کی موسیقی کو بام عروج تک پہنچایا ہے، اسی طرح ہندوستان کے مسلمان موسیقاروں اور صوفیوں نے انڈین میوزک کو اپنے لازوال جوہر کامل اور کمال فن سے سنوارا ہے۔ محمد بن قاسم کے ہندوستان میں آنے سے پہلے انڈین موسیقی دھرپد تک محدود تھی۔ یہ موسیقی عام طور پر مندروں اور دہارمک تہواروں کے موقع پر پوجا پاٹ کرتے اور رقص کرتے وقت گائی بجائی جاتی تھی۔ اس موسیقی کی لے لمبی اور سر ایک جھٹکے کے ساتھ سفر کرتے تھے۔ اس میں کوئی نغمگی اور اثر تاثیر نہیں تھی۔ صرف مذہبی عقیدت کا عنصر غالب تھا۔ مسلمانوں نے ہندوستان میں آ کر جہاں ہندوؤں کو کھانے پینے، کپڑے پہننے اور مجلسی آداب سکھائے، وہاں موسیقی میں بھی ایسی انقلابی تبدیلیاں کیں کہ اس کی یکسانیت کو ختم کر کے اس میں درد و سوز پیدا کیا۔ امیر خسرو نے نہ صرف سازوں میں تبدیلیاں کیا بلکہ نئے نئے راگ ایجاد کئے۔ پدھرپد کی جگہ خیال کی گائیکی کو رواج دیا۔ آج ہندوستان میں مسلمانوں کی موسیقی ہی گائی جاتی ہے۔ دھرپد صرف اس قدیم صنف موسیقی کو زندہ رکھنے کے لئے گائی جاتی ہے''۔

سباطی بڑے دلچسپی سے میری باتیں سن رہا تھا۔ کہنے لگا۔

''میں نے پاکستانی فنکار مہدی حسن اور رشماں کو سنا ہے۔ ان کی آوازیں مجھے بڑی پسند ہیں۔ مراکش میں بھی لوگ ان کے نغموں کے کیسٹ بڑے شوق سے خریدتے ہیں''۔

میں نے کہا: ''ان فنکاروں کے علاوہ ہمارے دوسرے کلاسیکل فنکار بھی ہیں جن کی شہرت ساری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے''۔

ہال کے سپیکر پر سپینش زبان میں کوئی اعلان ہو رہا تھا۔ سباطی نے ادھر کان لگا دیئے تھے۔ میں بھی چپ ہو گیا تھا۔ جب اعلان ختم ہوا تو سارا ہال ایک بار پھر زبردست تالیوں کے شور سے گونجنے لگا۔ لوگ نعرے بھی لگا رہے تھے۔ میں نے سباطی سے اعلان کے بارے میں استفسار کیا تو وہ ہنس کر بولا:

''خدا کو منظور رہیں تھا کہ ہم آج بل ادا کرتے۔ مجھے پہلے پتہ ہوتا تو ہم کافی کے ساتھ سنیکس کی کوئی مہنگی ڈش بھی منگوا لیتے''۔

میں نے پوچھا: ''آخر بات کیا ہوئی ہے؟''

سباطی ہنستے ہوئے بولا:

''ریستوران کے مالک کی طرف سے اعلان کیا گیا ہے کہ آج غرناطہ کے نامور موسیقار وسنتو گومیز کا یوم پیدائش ہے۔ اس خوشی میں اب تک جس گاہک نے جو کچھ منگوایا ہے، اس کی قیمت وصول نہیں کی جائے گی''۔

میں نے ہلکا سا قہقہہ لگا کر کہا:

''سباطی دوست! ہم سے واقعی بھول ہو گئی ورنہ ہم رات کا کھانا بھی ابھی سے کھا لیتے''۔

سباطی سگریٹ پیتے ہوئے سنجیدہ آواز میں بولا:

''تم دیکھ لو یہ لوگ اپنے فنکاروں سے کس درجہ والہانہ پیار کرتے ہیں۔ ویسے بھی یہ قوم موسیقی کی عاشق ہے''۔

گومیز ریستوران سے ہم نکلے تو رات کا پہلا پہر شروع ہو چکا تھا۔ سباطی کہنے لگا کہ رات کا کھا ہم غرناطہ کے پراسرار گنجان گلی کوچوں کے کسی ہوٹل میں کھائیں گے۔ مجھے اسکا خیال پسند آیا۔ کیونکہ میں غرناطہ کے گلی کوچوں کی مزید سیر کرنا چاہتا تھا۔ ہم ایک بازار سے گزر رہے تھے کہ سامنے سے ایک چھوٹا سا جلوس آتا دکھائی دیا۔ آگے آگے چمکیلے جبوں والے پادری تھے جنہوں نے ہاتھوں میں صلیبیں اٹھا رکھی تھیں۔ سباطی نے بتایا کہ آج ضرور عیسائیوں کے کسی سینٹ کا تہوار ہوگا۔ یہ جلوس اسی سلسلے میں نکلا ہے۔

''سپین میں مسیحیوں کے بڑے تہوار ہوتے ہیں۔ ہفتے میں دو تین تہوار ضرور آتے ہیں''۔

ہم ایک مکان کے پتھریلے تھڑے پر کھڑے ہو گئے۔ عورتیں مکانوں کی گیلریوں میں آ گئی تھیں۔ کسی کسی گیلری سے جلوس پر گلاب کی پتیاں بھی نچھاور کی جا رہی تھیں۔ آگے آگے ایک معصوم شکل لڑکا ہاتھوں میں مقدس پانی کا پیالہ لئے چل رہا تھا۔ ایک پادری کے ہاتھ میں زیتون کی شاخ تھی۔ وہ اسے مقدس پانی میں ڈبو کر مکانوں کے دروازوں پر چھڑکتا جاتا تھا۔ پیچھے سفید لباس والی لڑکیوں نے ہاتھوں میں لمبی لمبی جلتی ہوئی موم بتیاں تھام رکھی تھیں اور مقدس دعا پڑھ رہی تھیں۔ جلوس گزر گیا تو ہم بازار میں سے گزر کر ایک گلی میں داخل ہو گئے۔ بجلی کے کھمبوں پر ٹیوب لائٹس روشن تھیں۔ ہر مکان کے محرابی دروازے پر بھی روشنی ہو رہی تھی۔ ہم ایک مکان کے قریب سے گزرے تو دو نوجوان مطربوں کو دیکھا جو گٹاریں بجاتے ہوئے گا رہے تھے۔ سباطی کہنے لگا:

''یہ آج کے مقدس تہوار کے مطرب ہیں اور مذہبی گیت گا رہے ہیں''۔

مکان کا دروازہ کھلا تھا۔ اندر صحن میں روشنی ہو رہی تھی۔ اس روشنی میں صحن کے درمیان

میں بنا ہوا گول فوارہ صاف دکھائی دیتا تھا۔ فوارے میں سے رک رک کر پانی اچھل رہا تھا۔ سباطی کہہ رہا تھا:

''یہ ثقافتی ورثہ بھی عرب مسلمانوں کا ہے۔ ان کے مکانوں کے کشادہ دالانوں میں فوارہ ضرور ہوتا تھا۔ اس کے لئے عربوں نے زمین دوز نالیاں بنائی ہوئی تھیں دریا کا پانی ان نالیوں میں سے گزر کر گھروں میں آ جاتا تھا''۔

مطربوں کی ٹولی خاص عربی لے میں مقدس نغمہ گا رہی تھی اور ساتھ ساتھ گٹار اور دف بھی بج رہی تھی۔ ہم دوسری گلی میں آ گئے۔ یہاں سارے مکانوں کی گیلریوں میں پھولوں بھرے گملے بجلی کی روشنی میں بڑے خوب صورت لگ رہے تھے۔ ایک عورت کاندھوں پر پھولدار شال ڈالے ہاتھوں میں پانی کا تسلا لئے ایک گھر سے نکل کر دوسرے گھر میں داخل ہو گئی۔ اس نے ہماری طرف مسکرا کر دیکھا تھا۔ میں آج بھی سوچتا ہوں کہ کیسی کیسی خوب صورت شکلیں زندگی میں صرف ایک بار ہی نظر آتی ہیں، وہ صورتیں ایک جھلک دکھا کر کہاں غائب ہو جاتی ہیں۔۔۔؟

غرناطہ کے نیم روشن پراسرار گلیوں میں سے نکل کر ہم ایک بازار میں آ گئے جس کا آدھا حصہ اوپر سے ڈھکا ہوا تھا۔ یہاں دکانوں پر مختلف چیزیں سجی ہوئی تھیں۔ پھل کی دکانیں بھی تھیں۔ ہم کتابوں کی ایک دکان میں چلے گئے۔ یہاں الماریوں اور کاؤنٹر اور میزوں پر کتابیں ڈھیروں کی شکل میں پڑی تھیں۔ سباطی نے بتایا کہ یہاں پرانی کتابیں بکتی ہیں جو آدھی سے بھی کم قیمت پر مل جاتی ہیں۔ میں کتابیں دیکھنے لگا۔ زیادہ تر کتابیں ہسپانوی زبان کی تھیں۔ مشہور ہسپانوی مصور پکاس اور الگریکو کی تصویروں کے پرنٹ بھی رکھے ہوئے تھے۔ ایک طرف الماری میں وائن کی بوتلیں، چاکلیٹ کے ڈبے، سگرٹوں کے پیکٹ اور لکھنے پڑھنے کا سامان بھی

نظر آ رہا تھا۔ سباطی ہسپانوی زبان پڑھ لکھ لیتا تھا۔ وہ بڑے شوق سے ایک میز کے پاس کھڑا کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔ میرے قریب ہی کاؤنٹر پر نوجوان سپینش دکاندار کھڑا اپنے گاہک کے لئے بل بنا رہا تھا۔ میں نے اس سے انگریزی میں پوچھا:

''آپ کے پاس عربی کی کوئی کتاب ہے؟''

نوجوان دکاندار اور ساتھ ہی گاہک نے بھی ذرا سا چونک کر میری طرف دیکھا۔ دکاندار نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا:

''نو عربیک پلیز''۔

اور دوبارہ بل بنانے میں مصروف ہو گیا۔ جس گاہک کا بل بن رہا تھا، وہ بھی میرے قریب ہی کھڑا تھا۔ اس نے منہ سے سگار نکال کر مجھ سے انگریزی میں پوچھا:

''سینور! تم کسی مسلمان ملک سے آئے ہو کیا؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا:

''میں پاکستان سے آیا ہوں۔ میں ٹورسٹ ہوں''۔

دکاندار نے بل کا ٹوٹل کرتے ہوئے گوشہ چشم سے مجھے دیکھا۔

گاہک جو پختہ عمر کا ہسپانوی تھا۔ کہنے لگا:

''یس پاکستان۔ میں نے پاکستان کے متعلق پڑھا ہے۔ گڈ مسلم پیپل''۔

وہ رقم ادا کر کے کتابوں کا پیکٹ بغل میں دبا کر چل دیا۔ دکاندار نے کاروباری مسکراہٹ چہرے پر سجاتے ہوئے مجھ سے استفسار کرتے کیا:

''سینور! میں خدمت کر سکتا ہوں''۔

میں مسکرا کر سباطی کی طرف آ گیا۔ وہ کتاب ہاتھ میں کھولے میری طرف پہلے سے

دیکھ رہا تھا۔

''کاؤنٹر پر کیا باتیں ہو رہی تھیں؟''

میں نے اسے ساری بات سنائی تو وہ بولا:

''میں نے تمہیں بتایا تھا ناں۔ یہاں عربی زبان ایک اجنبی زبان سمجھی جاتی ہے۔ حالانکہ یہ واحد زبان ہے جسکا اثر سپینش زبان کے ہر لفظ پر ہے۔ یہ یہاں کے لوگوں کا تعصب ہے کہ عربی کا نام بھی سننا پسند نہیں کرتے''۔

کتابوں کی اس دکان کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا سپینش ہوٹل تھا۔ یہاں بیٹھ کر ہم نے سستا مگر بڑا مزیدار کھانا کھایا۔ وہیں کافی بھی پی۔ سباطی کہنے لگا:

''یہ لوگ آج گرم مصالحے بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ ان کی کوئی ڈش ایسی نہیں جس میں گرم مصالحے نہ ڈالے جاتے ہوں۔ یہ گرم مصالحے مسلمان اپنے ساتھ لائے تھے لیکن مسلمانوں کی آمد سے پہلے جب سپین کے جہاز ران جنوبی سمندروں میں سرزمین ہند کی تلاش میں سرگرداں تھے تو عرب تاجروں نے ہی انہیں انڈیا، ملایا اور اہند چینی کے تجارتی راستوں سے روشناس کرایا تھا۔ ان نئے تجارتی راستوں کے کھل جانے سے سپین مالا مال ہو گیا''۔

سباطی سپین اور پرتگال کی ابتدائی تاریخ پر دیر تک تبصرہ کرتا اور میری معلومات میں اضافہ کرتا رہا۔ پھر کہنے لگا:

''اب کیا پروگرام ہے؟''

میرا پروگرام تو رات کو قصر الحمرا کے ایوان بنی سراج میں غرناطہ کے آخری مسلمان تاجدار ابی عبداللہ کے خالی اور ویران تخت کی زیارت کا تھا مگر میں نے سباطی کو کچھ نہ بتایا۔ میں نے کہا:

''میرا خیال ہے اب واپس ہوسٹل میں ہی چلتے ہیں''۔

چنانچہ ہم وہاں سے دو بسیں بدلنے کے بعد ہوسٹل پہنچ گئے۔ سباطی کہنے لگا۔

بات یہ ہے کہ میں تو یہاں سے کل سیوائیل کی طرف نکل جاؤں گا۔ تم نے کیا پروگرام بنایا ہے''۔

میں ابی عبداللہ کے تخت کی رات کو زیادت کئے بغیر وہاں سے واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔ ویسے بھی میں چاہتا تھا کہ بالکل اکیلا کسی گائیڈ کے بغیر غرناطہ کی سیر کروں۔ کوئی مجھے پوچھنے والا نہ ہو کہ میں کہاں جا رہا ہوں اور کہاں سے آ رہا ہوں۔ سباطی بڑا اچھا انسان تھا۔ بڑا اچھا دوست تھا مگر وہ مجھے روکتا ٹوکتا ضرور تھا۔ یہاں مت جانا، وہاں رات کو روحیں آتی ہیں، وہاں نہ جانا۔ یہ باتیں اور ہدایتیں میری آزادانہ سیاحت کی راہ میں رکاوٹ بن رہی تھیں۔ چنانچہ جہاں مجھے سباطی کا ساتھ چھوٹ جانے سے افسوس ہوا، وہاں مجھے خوشی بھی ہو رہی تھی کہ اب میں اپنی مرضی سے جہاں چاہے، آ جا سکوں گا۔ میں نے کہا:

''میرا ارادہ غرناطہ میں مزید کچھ روز قیام کرنے کا ہے۔ اس کے بعد میں سیوائیل نہیں بلکہ قرطبہ کی طرف نکل جاؤں گا۔ میں مسجد قرطبہ میں خدا کے حضور ایک سجدہ ضرور کرنا چاہتا ہوں''۔

سباطی ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد بولا:

''ٹھیک ہے، میں تمہارے پروگرام میں حائل نہیں ہونا چاہتا۔ دراصل میں جب بھی چھٹیوں میں سپین کی سیاحت کو آتا ہوں تو میرا ایک سیٹ روٹ ہوتا ہے اور ایک خاص وقت پر مجھے واپس کالج میں بھی پہنچنا ہوتا ہے۔ میں کل چلا جاؤں گا۔ مگر میں اپنے دوست سے کہہ کر اسی ہوسٹل میں تمہارے ٹھہرنے کا بندوبست کر جاؤں گا۔ تم جتنے دن چاہو، یہاں رہ سکو گے۔''

میں نے سباطی کا شکریہ ادا کیا۔ وہ بولا:

''تم نے کہا تھا کہ تم کسی ہسپانوی خانہ بدوش قبیلے کے ساتھ بھی سفر کرنا چاہتے ہو، اسکا کیا پروگرام ہے؟''

میں نے کہا: ''ہاں ہاں، وہ پروگرام اپنی جگہ پر قائم ہے''۔

سباطی کہنے لگا: ''اگر تم خانہ بدوشوں کے ساتھ سفر کرنا چاہتے ہو تو تمہیں غرناطہ کے شمال مشرق میں سیرانوار کی وادیوں میں ایسا کوئی قافلہ سفر کرتا ہوا مل جائے گا۔ مگر میں ایک بار پھر تمہیں خبردار کرنا چاہوں گا کہ ان خانہ بدوشوں کے ساتھ سفر کرنا خطرے سے خالی نہیں۔ یہ لوگ جرائم پیشہ ہوتے ہیں، تمہیں ان سے نقصان پہنچ سکتا ہے۔ بہتر ہے کہ تم شاہراہوں کے ساتھ ساتھ سفر کرو۔ اس طرح تم محفوظ بھی ہو گے اور اپنی مرضی کے مطابق جہاں چاہو، ٹھہر سکو گے''۔

مگر میں ہسپانیہ کے خانہ بدوشوں کے ساتھ سفر کر کے ایک نیا تجربہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ میں نے ان لوگوں کی تاریخ پڑھی تھی اور اس تاریخ نے مجھے بتایا تھا کہ ہسپانوی خانہ بدوشوں کا سلسلہ برصغیر پاک و ہند کے خانہ بدوشوں سے جا ملتا ہے۔ میں اس تاریخی مفروضے کی تحقیق بھی کرنا چاہتا تھا۔ ویسے بھی مجھے شوق تھا کہ میں سپین کی خانہ بدوش عورتوں کو دیکھوں۔ میں نے سن رکھا تھا کہ چاندنی راتوں میں وہ گٹار اور دف کی دھن پر مجیرے بجاتی ہوئی رقص کرتی ہیں۔ میں سباطی کو اپنے عزائم کے بارے میں نہیں بتانا چاہتا تھا۔ میں نے اسے یہی کہہ دیا: ''ٹھیک ہے دوست، میں تمہاری ہدایت پر عمل کروں گا اور خانہ بدوشوں کے ساتھ سفر نہیں کروں گا''۔

سباطی خوش ہوا۔ کہنے لگا: ''اس میں تمہاری ہی بھلائی ہے''۔

دوسرے دن دوپہر کے وقت سباطی مجھ سے جدا ہو گیا۔ اس نے اپنے یونیورسٹی کیمپس

کے دوست کو میرے بارے میں بتا دیا کہ میں ہوسٹل میں مزید کچھ روز قیام کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے دوست نے کہا:

''نو پرابلم سینور! تم جتنے دن چاہو، ہوسٹل میں ٹھہر سکتے ہو لیکن اس دوران اگر یورپ سے کوئی دوسرا ٹورسٹ سٹوڈنٹ آ گیا تو اسے بھی تمہارے کمرے میں ہی ٹھہرانا ہوگا''۔

میں اعتراض کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ ویسے بھی میرا ارادہ غرناطہ میں دو تین دن ٹھہرنے کے بعد سیرانوار کی وادیوں میں کسی خانہ بدوش قبیلے کے ساتھ قرطبہ کی طرف نکل جانے کا تھا۔

سباطی کے جانے کے بعد میں تھوڑا اداس بھی ہو گیا۔ کچھ اکیلا پن بھی محسوس ہونے لگا اور کسی قدر میں نے اطمینان کا سانس بھی لیا۔ اب میں پوری آزادی سے جہاں چاہے، جس وقت چاہوں، جا سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے اسی رات بنی سراج کے ایوان میں ابی عبداللہ کے تخت کی زیارت کا فیصلہ کر لیا۔ سباطی کو میں نے دوپہر کے وقت بس پر چڑھایا تھا۔ شام تک میں شہر میں ادھر ادھر آوارہ گردی کرتا رہا۔ رات کو ایک سستے سے ہوٹل میں کھانا کھایا اور ہوسٹل کے کمرے میں آ کر لیٹ گیا۔ میں نے بٹوے سے رقم نکال کر ہسپانوی کرنسی کا جائزہ لیا۔ جس حساب سے وہاں کھانے پینے کی چیزیں فروخت ہوتی تھیں، اسی حساب سے میرے پاس اتنی رقم تھی کہ میں کفایت شعاری سے کام لیتے ہوئے مزید ایک ماہ اس ملک میں گزار سکتا تھا۔ اس میں شرط یہ تھی کہ میں راتیں کسی ہوٹل میں بسر نہ کروں اور ایک شہر سے دوسرے شہر تک شاہراہوں پر لفٹ لے لے کر سفر کروں۔ سگریٹ میں نے بہت سستے پینے شروع کر دیئے تھے جو پاکستانی کرنسی کے حساب سے پچاس پیسے کا ایک پیکٹ آتا تھا۔ اس کے علاوہ میں نے یہ بھی سوچ لیا تھا کہ غرناطہ سے نکلنے کے بعد کسی دوسرے شہر میں چھوٹی موٹی نوکری بھی کر لوں گا۔ میرا

ارادہ قرطبہ جا کر کوئی جاب کرنے کا تھا۔ کیونکہ میں قرطبہ میں کم از کم ایک مہینہ ٹھہرنا چاہتا تھا۔ سباطی جاتے ہوئے مجھے کچھ رقم اپنی طرف سے بھی دے گیا تھا۔

دن ڈھلنے تک میں ہوسٹل کے کمرے میں ہی رہا۔ اس کے بعد ہوسٹل سے نکلا اور بس میں سوار ہو کر قصر الحمرا کی طرف روانہ ہو گیا۔ میرا پروگرام یہ تھا کہ شام ہونے سے پہلے پہلے قصر الحمرا میں داخل ہو جاؤں۔ کچھ دیر بنی سراج کے ایوان کے اردگرد باغات وغیرہ میں پھرتا رہوں اور جب رات ہو تو اس ایوان میں آ جاؤں جہاں غرناطہ کے آخری شہنشاہ ابی عبداللہ کا تخت تھا اور جس کے بارے میں سباطی نے بتایا تھا کہ آدھی رات کے بعد وہاں روحیں اترتی ہیں۔

میں رات کے وقت قصر الحمرا میں داخل ہونے کے لئے گارڈ کو رشوت نہیں دے سکتا تھا۔ اب میرے لئے پیسے بچا بچا کر رکھنا اور سوچ سمجھ کر خرچ کرنا بہت ضروری تھا۔ کیونکہ سباطی کے جانے کے بعد میں صحیح معنوں میں تنہا رہ گیا تھا۔ قصر الحمرا میں سے اکثر سیاح واپس آ رہے تھے کیونکہ شام ہونے والی تھی۔ باہر گیٹ کے سامنے ریستوران میں بڑی رونق تھی۔ پارکنگ میں گاڑیاں کھڑی تھیں۔ میں نے ٹکٹ لیا اور قصر الحمرا کے بڑے گیٹ میں سے گزر کر الحمرا کے باغات میں آ گیا۔ یہاں قلعے کی راہ داریوں میں سے نکلتا ہوا جس قصر میں بنی سراج کا ایوان تھا، اس کے محرابی درواڑ کی بائیں جانب باغ کے تختے میں زیتون کے درختوں کے پیچھے ایک طرف سے چھپ کر بیٹھ گیا۔

اب مجھے رات کا اندھیرا چھا جانے کا انتظار تھا۔

میں نے ریستوران میں ہی کچھ کھا پی لیا تھا اور رات کو کھانا کھانے کی مجھے ضرورت نہیں رہی تھی۔ باغ کی روشوں پر کچھ غیر ملکی سیاح چل پھر رہے تھے اور فلیش گن سے تصویریں بھی اتار رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد سورج غروب ہو گیا۔ الحمرا کے باغات اور قصر کے گنبدوں اور

چوکور مورش طرز تعمیر کے میناروں پر شام کے سائے اترنا شروع ہو گئے۔ رات کے وقت قصر الحمرا کے اندر بہت کم گارڈ پہرے پر ہوتے تھے۔ یہ مجھے معلوم ہو چکا تھا۔ میں نے ایک وردی پوش بوڑھے ہسپانوی گارڈ کو دیکھا جو ایوان بنی سراج کے دروازے میں سے نکل رہا تھا۔ باہر آ کر اس نے دروازے کی محراب پر ایک نگاہ ڈالی۔ سگریٹ سلگایا اور اس کے کش لگاتا عقبی کھجوروں کے جھنڈوں کی طرف چلا گیا۔ فضا مرطوب ہو گئی تھی۔ الحمرا کے باغوں کے مختلف پھولوں کی ہلکی ہلکی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ میں کچھ دیر وہیں بیٹھا سگریٹ پیتا اور لاہور کے بازاروں، گلی کوچوں، دوستوں اور باغوں کو یاد کرتا رہا۔ رات آہستا آہستہ گزر رہی تھی۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ گھڑی کی چمکتی ہوئی سوئیوں نے بتایا کہ ابھی رات کا پہلا پہر ہی شروع ہوا ہے۔ میرے لئے آدھی رات تک وقت گزارنا ایک مشکل مرحلہ تھا۔ کیونکہ میں پہرے داروں سے بچنے کی خاطر باغوں اور راہ داریوں میں آزادی سے نہیں پھر سکتا تھا کہ کچھ وقت اسی طرح سے ہی گزر جائے۔

باغ کے ایک قطعے سے نکل کر دوسرے قطعے میں چلا آیا۔ ایوانوں کے اندر میں اس لئے داخل ہونے سے گریز کر رہا تھا کیونکہ ایوانوں کے اندر کسی نہ کسی چوکیدار کے ملنے کا امکان تھا۔ باغات کے قطعوں میں کوئی چوکیدار نہیں تھا۔ میں چوکیدار کو رشوت نہ دے کر زر مبادلہ بچانا چاہتا تھا۔

الحمرا کے باغات کی طرز تعمیر ایسی ہے کہ وہاں کشادہ پلاٹ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ایوانوں کے آگے پیچھے دو منزلہ برآمدوں کے ستونوں والی دیواروں کے درمیان روشوں کے ارد گرد یہ باغ بنائے گئے ہیں جن کے وسط میں سنگ مرمر کی فواروں والی چھوٹی چھوٹی نہریں بہتی ہیں۔ جہاں کھلے باغات کے قطعے ہیں، وہاں بھی برج، بارہ دریاں اور بڑے بڑے گول

مرمریں فوارے بنے ہوئے ہیں۔ الحمرا کے باغات کا نقشہ ہمارے لاہور کے باغ جناح کے باغات کے قطعات سے بہت مختلف ہے۔

بہر حال مجھے آدھی رات تک وقت گزارنا تھا۔ میں کبھی ایک باغا کے قطعے میں آ کر بیٹھ جاتا۔ وہاں سے اٹھتا تو کسی دوسرے باغ کے برآمدے کے ستونوں کے پیچھے سے گزرتا دوسری منزل کی بارہ دری میں آ کر بیٹھ جاتا۔ میری یہ کوشش بھی ہوتی تھی کہ مجھ پر کسی چکر لگاتے چوکیدار کی نظر نہ پڑے۔ اسی طرح پھرتے پھراتے رات کے پونے بارہ بج گئے۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ بنی سراج کے ابی عبداللہ والے دیوان میں آدھی رات کے بعد سرگوشیاں سنائی دیتی ہیں۔

میں اس دوران برج الامیرات والے فوارے کی طرف بالکل نہیں گیا تھا۔ ادھر مجھے حبشی سردار کی روح سے مڈبھیڑ ہو جانے کا خطرہ تھا جس سے مجھے واقعی خوف آنے لگا تھا۔ جب میری گھڑی نے رات کے پورے بارہ بجائے تو میں نے اللہ کا نام لیا اور بنی سراج کے ایوان کی عقبی راہ داری میں سے ہوتا ہوا پتھر کی تراشی ہوئی دو چار سیڑھیاں اتر کے ایوان بنی سراج کی کونے والی محرب کے پاس پہنچ گیا۔ ان سارے ایوانوں کا حدود اربعہ مجھے سباطی کے ساتھ چل پھر کر معلوم ہو چکا تھا۔

دروازے کی محراب کے نیچے کھڑے ہو کر میں نے ایوان میں نگاہ ڈالی۔ یہاں اندھیرا تھا۔ یہ ایوان اس طریقے سے تعمیر کئے گئے تھے کہ ان میں چھتوں کے قریب مخروطی اور محرابی جھلمنیوں میں سے دن کے وقت سورج کی شعاعیں اور رات کے وقت چاندنی اندر آتی تھی۔ وہ چاند رات نہیں تھی مگر ستاروں بھری رات کی دھیمی دھیمی روشنی ایوان میں ضرور آ رہی تھی۔

مجھے تخت ابی عبداللہ کے پاس جانا تھا جو اس ایوان سے آگے تیسرے تخت میں واقع تھا۔ میں منقش دیواروں کے ساتھ ساتھ نیم اندھیرے میں چلتا ایک تختے سے گزر کر دوسرے

اور پھر تیسرے تخت میں آ گیا۔ یہ شاہی محل کا کوئی ہال کمرہ لگتا تھا۔ دیوار میں جو سنگ مرمر کی جالیاں لگی تھیں، ان میں سے ستاروں کی پھیکی روشنی اندر آ رہی تھی۔ اس پھیکی روشنی کے غبار میں مجھے درمیان میں ایک تخت بچھا ہوا دکھائی دیا۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا تخت کے پاس آ گیا۔

یہ غرناطہ کے آخری مسلمان تاجدار ابی عبداللہ کا تخت تھا۔ کبھی یہ جاہ و جلال والا بادشاہ اس تخت پر بیٹھ کر فرمان جاری کیا کرتا تھا۔ سارا ایوان چاندنی کے چراغوں سے جگمگا رہا ہوتا تھا۔ مگر اب وہاں سوائے عبرت انگیز سکوت اور اندھیرے کے اور کچھ نہ تھا۔ تخت خالی پڑا تھا۔ اس کی پٹی پر جو ہیرے جواہرات جڑے ہوتے تھے، وہ حملہ آور عیسائی حکمران اکھاڑ کر لے گئے تھے۔ میں نے تخت کو ہاتھ لگایا۔ تخت کا قیمتی زمرد والا سنگ مرمر برف کی طرف ٹھنڈا لگا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ افسانوی روایت کے مطابق روحوں کے اترنے کا وقت ہو گیا ہے۔ مجھے خوف سا محسوس ہونے لگا۔

مگر میں اندلس کی شہزادی کی روح کی طرح یہاں اترنے والی روحوں کا بھی مشاہدہ کئے بغیر وہاں سے واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔ آپ اسے میرا شوق سمجھ لیں کہ میں اسلام کے ان مجاہدوں کی زیارت کرنا چاہتا تھا جنہوں نے کفر کی سرزمین پر اسلام کا پرچم لہرایا اور آٹھ سو سال تک سپین پر اس طرح حکومت کی کہ یورپ کی تاریخ بھی ان کے کارناموں کا اعتراف کرتی ہے۔ اور ان کے بنائے ہوئے ضابطوں اور کلیوں پر چل کر آج میڈیسن اور فزکس میں اتنی ترقی کر رہی ہے۔ کون اس حقیقت سے انکار کرے گا کہ سمندری سفر کا رخ متعین کرنے والا آلہ اضطرلاب سپین کے ایک مسلمان سائنس دان نے ایجاد کیا تھا۔ خود اس آلے کا نام بتاتا ہے کہ میں کسی عرب مسلمان کی ایجاد ہوں۔ یورپ کے لوگ اس آلے کو آسٹرلوب کہتے ہیں۔ اسی طرح طب جغرافیہ، ریاضی، فلسفہ، طبیعات، فلکیات میں ایسی سینکڑوں ایجادیں اور نئے کلیے

ہیں جن کی ایجاد کا سہرا سپین کے مسلمانوں کے سر جاتا ہے۔ اپنی آٹھ سو سالہ حکومت کے دوران مسلمان حکمرانوں نے اقلیتوں کے ساتھ جس رواداری اور مذہبی آزادی کا مظاہرہ کیا، اس کی مثال یورپ اور بھارت کی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ ایک انگریز دانشور ونووڈ ریڈ اپنی کتاب ''فائٹر ڈوم آف مین'' کے صفحہ ۲۲۶ پر سپین میں مسلمانوں کے دور اقتدار کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''مسلمان عربوں نے اپنے دور حکومت میں سپین کو ترقی اور خوش حالی کے اس مقام تک پہنچا دیا کہ جو مقام سپین کو مسلمانوں کے چلے جانے کے بعد آج تک نصیب نہیں ہو سکا''۔

یہی دانش ور آگے چل کر لکھتا ہے:

''مسلمانوں کے سپین میں عیسائیوں کو پوری مذہبی آزادی تھی۔ ان کے گرجا گھروں کی حفاظت اور دیکھ بھال حکومت کے سپرد تھی۔ مسلمانوں نے سپین کی سرزمین کو عالی شان مسجدوں، عظیم پلوں، ہسپتالوں، پرشکوہ محلات اور پختہ شاہراہوں سے آراستہ کیا۔ انہوں نے زمین دوز پختہ نالیاں بنائیں جن میں پہاڑی چشموں سے پانی شہروں اور لوگوں کے گھروں تک پہنچتا تھا۔ انہوں نے سپین میں چاندی، تانبہ، سکے اور سونے کی کانیں دریافت کیں۔ وہ گنے کی کاشت کرتے، اس کی شکر بناتے اور یہ شکر دوسرے ممالک کو برآمد بھی کی جاتی۔ مسلمانوں کے سپین میں وسیع پیمانے پر ریشمی اور سوتی کپڑا تیار ہوتا اور اسے سمندری راستے سے قسطنطنیہ اور یورپ کے دوسرے ممالک میں بھیجا جاتا۔ اس وقت جبکہ یورپ میں کتابیں دیکھنے کو بھی بہت کم ملتی تھیں اور جس کسی کے پاس کوئی کتاب ہوتی تھی، وہ گرجا گھر میں جا کر اسے قربان گاہ پر رکھ دیتا تھا اور پادری صاحب سے اس کتاب کے عوض اپنے گناہوں کی بخشش کا طلب گار ہوتا تھا۔ اس وقت جبکہ گرجا گھر میں سو ڈیڑھ سو کتابوں کے پلندوں کو بہت بڑا اور نایاب خزانہ سمجھا جاتا

تھا، اس وقت جبکہ انگلستان کا کوئی ایک پادری بمشکل کسی لاطینی کتاب کا انگریزی میں ترجمہ کر سکتا تھا، ٹھیک اس وقت مسلمانوں کے سپین میں بچے بچے کو زیور تعلیم سے آراستہ کیا جاتا تھا اور سپین کے ہر شہر کی ایک اپنی عظیم الشان لائبریری ہوتی تھی جس میں ہزاروں کتابیں موجود تھیں اور لوگوں کو کتابیں جمع کرنے اور انہیں پڑھنے کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ اور مسلمان دست کار بھاری تعداد میں سوتی اور ریشمی کپڑا تیار کرتے تھے۔ یہ مسلمانوں کا سپین ہی تھا جہاں خواتین گرائمر اور لسانیات میں نام پیدا کر رہی تھیں اور جہاں کے نابینا بھی فلاسفر تھے اور جہاں اس زمانے میں اڑنے والی مشینیں بنانے کے لئے بھی تجربات ہو رہے تھے"۔

میں اس انگریز دانش ور کی کتاب کے اس حصے کو انگریزی میں یہاں نقل کرنا چاہتا تھا لیکن اپنے ان قارئین کے لئے اسکا ترجمہ کر دیا جو انگریزی نہیں پڑھ سکتے۔ اگر کسی صاحب کو اوپر حوالے کے طور پر دیئے گئے پیراگراف پر شک ہو تو وہ پاکستان کے کسی بھی بڑے شہر کی لائبریری میں جا کر انگریز مصنف ونووڈ ریڈ کی اس کتاب کو کھول کر اس کے صفحہ ۲۶۲ پر نقل کی ہوئی عبارت انگریزی میں لکھی پڑھ سکتے ہیں۔ اگر لائبریری میں یہ کتاب نہ ملے تو میرے پاس آ کر دیکھ سکتے ہیں کیونکہ یہ کتاب میرے پاس عرصہ تیس برس سے موجود ہے۔ یہ کتاب پہلی بار لندن کے مشہور پبلشنگ ادارے تھنکرز لائبریری والوں نے ۱۹۳۲ء میں چھاپی تھی۔

ان تمام حقائق کو مدنظر رکھتے ہوئے میرے ایسا سیدھا سادا مسلمان سیاح ہسپانیہ کے مسلم حکمرانوں، ان کے سرداروں اور ان کے دانشوروں کی روحوں کو ہی ایک نظر دیکھنے کے لئے بے تاب رہنے پر حق بجانب تھا اور پھر روحوں سے ملاقات کرنے کے لئے میرا بجر کھل چکا تھا۔ بجر کھلنا پنجابی میں کہتے ہیں جو میں نے اسی طرح لکھ دیا ہے۔ پنجابی میں جھاکا اترنا بھی کہتے ہیں یعنی جس چیز کا ڈر خوف باقی نہ رہے۔

اب میں واپس قصر الحمرا کے ایوان ابی عبداللہ میں آتا ہوں۔ جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں۔ میں رات کے بارے بجے کے بعد اس ایوان میں غرناطہ کے آخری تاجدار ابی عبداللہ کے ویران تخت کے پاس کھڑا تھا۔ ایوان میں ایک عبرت ناک سکوت چھایا ہوا تھا۔ سنگ مرمر کی جالیوں میں سے جو چھت کے قریب بنی ہوئی تھیں، ستاروں کی روشنی کا دھندلا سا غبار اندر آ رہا تھا۔ اس دھندلی روشنی میں ایک شان و شوکت والے شہنشاہ کے خالی اور ویران تخت کو دیکھ کر بھی دل پر ہیبت طاری ہو رہی تھی۔ میں اس سنگین خاموشی میں تخت کے پاس کھڑا تھا کہ مجھے ایسا لگا جیسے بہت سے لوگ بھاری قدموں کے ساتھ چلے آ رہے ہوں۔ میں جلدی سے ایوان کے سب سے آخری ستون کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گیا۔ آوازیں نزدیک ہوتی جا رہی تھیں۔ پھر مجھے چاندنی ایسی روشنی کا غبار سا مشرقی محراب کی جانب سے ایوان میں داخل ہوتا محسوس ہوا۔ پھر قدموں کی آوازیں دھیمی ہو گئیں اور روشنی پھیلتی چلی گئی۔ اس کے بعد کیا دیکھتا ہوں کہ حبشی غلاموں کی دو قطاریں ایک دوسرے کے متوازی محرابی دروازے میں سے نکل کر ایوان میں داخل ہو رہی ہیں۔ ہر غلام نے چاندی کے روشن چراغ ہاتھوں میں اٹھائے ہوئے تھے۔ ان چراغوں کی روشنی میں ایوان کا سنگ مرمر جگمگانے لگا۔ حبشی غلام تخت کی دونوں جانب دیوار کے ساتھ لگ ادب سے کھڑے ہو گئے۔ اس کے بعد قدیم عربی لباس و زیں ملبوس، اسلحے سے لیس سپاہیوں کا ایک دستہ اندر داخل ہوا۔ یہ سپاہی دراز قد تھے اور ان کے سانولے اور گورے چہرے چراغوں کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ ان کے بعد اپنے محافظ دستے کے ساتھ ایک بلند قامت پر جلال چہرے اور شاہی لباس والا عرب ایوان میں داخل ہوا جس کی سیاہ ریشمی عبا پر ہیرے نیلم، یاقوت ستاروں کی طرح چمک رہے تھے۔ سر پر سفید عمامہ تھا۔ عمامے میں بھی قیمتی جواہرات جگمگا رہے تھے۔ وہ بڑے وقار سے قدم اٹھاتا تخت کی طرف بڑھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ

حیرت انگیز آن بان اور شان وشوکت والا ذی وقار شخص، غرناطہ کے آخری تاجدار کے سوا کوئی اور نہیں ہوسکتا۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ابی عبداللہ کا جو تخت تھوڑی دیر پہلے خالی اور بے نور سا تھا، اب وہ جڑاؤ اور طلائی تخت میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اس کے کناروں کے ساتھ مرجان، عقیق اور نیلم و یاقوت کی لڑیاں لٹک رہی تھیں اور تخت کی دونوں جانب وزراء اور امرا کی مسندیں لگ گئی تھیں۔ بادشاہ تخت پر بیٹھ گیا۔ اس کے ساتھ ہی عمامہ پوش نورانی چہروں والے بزرگ امراء، وزراء بھی اپنی اپنی مسندوں پر ادب سے دوزانو ہو کر بیٹھ گئے۔ شہنشاہ کا محافظ دستہ تخت کے پیچھے چاق و چوبند کھڑا ہو گیا۔ اس کے بعد ایوانوں پر گہری خاموشی چھا گئی۔ لیکن اس خاموشی میں عبرت اور افسوس کا پہلو نہیں تھا بلکہ اس خاموشی میں مسلمانوں کے گزرے ہوئے درخشاں عہد کا جلال اور تمکنت تھی۔ اتنے میں سامنے والے ستونوں کے پیچھے سے دو عربی لباس والے آدمی داخل ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں چاندی کے طشت تھے جو ہیرے جواہرات سے بھرے ہوئے تھے۔ تخت کے قریب آ کر وہ آداب شاہی کے مطابق تعظیم بجالائے اور ہاتھ بڑھا کر ہیرے جواہرات سے بھرے ہوئے طشت بادشاہ کے حضور پیش کئے۔ بادشاہ نے اپنے ہاتھ سے باری باری ایک ایک طشت کو چھوا اور کوئی جملہ کہا۔

میں نے صرف بادشاہ کے ہونٹ ہلتے ہوئے دیکھے۔ مجھے اس کی آواز بالکل سنائی نہ دی۔ دونوں عرب امراء جواہرات کے طشت لئے ادب سے تعظیم بجالائے اور الٹے قدموں واپس چلے گئے۔ اس کے بعد ایک بزرگ امیر نے جس کے سفید عمامے پر چاند کا گمان ہو رہا تھا، اٹھ کر کوئی فرمان پڑھا۔ جو لپٹے ہوئے ریشمی کاغذ پر لکھا ہوا تھا۔ مجھے اس بزرگ امیر کی آواز بھی نہیں آ رہی تھی۔ میرے سامنے گویا اندلس کی سنہری تاریخ کا ایک شاہی منظر کسی خاموشی فلم کی طرح چل رہا تھا۔ میں ستون کے پیچھے دم بخود دبکا بیٹھا تھا۔ حیرانی کی بات تھی کہ کسی کو

میری موجودگی کا احساس نہیں ہوا تھا جبکہ شہزادی سریۃ کی روح نے فوراً میری موجودگی کو محسوس کرلیا تھا۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ اس دربار میں میری موجودگی کو تغافل شاہانہ کے تحت نظر انداز کر دیا گیا ہو۔ ویسے بھی اگر یہ روحیں تھیں تو نورانی روحیں تھیں اور نورانی روحیں جہاں سے گزرتی ہیں، وہاں امن اور سکون کا نور پھیلتا چلا جاتا ہے۔

بزرگ امیر کوئی فرمان یا عہد نامہ پڑھنے کے بعد تعظیم بجالا کر اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ بادشاہ نے اپنا سیدھا ہاتھ اٹھا کر کچھ فرمایا جسے وہاں موجود سب درباریوں نے سنا مگر میں نہ سن سکا۔ ایک بار پھر شاہی دربار پر گہرا سکوت چھا گیا۔ دو تین سیکنڈ تک ہر کوئی اپنی اپنی نشست پر بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ پھر بادشاہ آہستہ سے تخت سے اٹھا۔ اس کے ساتھ ہی محافظ دستے میں حرکت پیدا ہوئی اور اس نے بادشاہ کو اپنے جلو میں لے لیا۔ چاندی کے چراغوں والے حبشی لڑکے ایک بار پھر قطاریں بنا کر آگے آگے چل پڑے۔ بادشاہ کے پیچھے تمام درباری اور امراء بھی اپنی اپنی مسندیں چھوڑ کر پورے ادب و احترام کے ساتھ ساتھ باندھے چلے۔ یہ شاہی جلوس ایوان کے مشرقی دروازے کی طرف جا کر میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ پیچھے چاندی کے چراغوں کی روشنی کا غبار سا رہ گیا۔ دیکھتے دیکھتے وہ بھی اندھیرے کے پردوں میں غائب ہو گیا۔ ایوان اب ایک بار ویران اور خالی ہو گیا۔ تخت پر جو جڑاؤ قالین بچھا تھا، وہ بھی غائب ہو چکا تھا۔

کیا یہ غرناطہ کے آخری تاجدار کا دربار تھا؟

کیا میں نے ابی عبداللہ کی زیارت کی تھی؟ دماغ ماننے کو تیار نہیں تھا مگر دل کہتا تھا کہ تم نے جو کچھ دیکھا ہے، وہ حقیقت تھی اور تم جو سوچ رہے ہو، وہ بھی حقیقت ہے۔ اصل میں دیکھا ہے، وہ حقیقت تھی اور تم جو سوچ رہے ہو، وہ بھی حقیقت ہے۔ اصل میں دیکھا جائے تو حقیقت

کیا ہوتی ہے؟ جو چیز ہماری سمجھ میں نہ آئے، ہم اسے اپنا وہم سمجھتے ہیں اور جو چیز ہماری سمجھ میں آ جائے، وہ حقیقت بن جاتی ہے۔ چنانچہ میرے خیال کے مطابق جیسے جیسے انسان کا فہم اور علم ترقی کر رہا ہے، تو اہمات اور وہم حقیقتوں میں بدلتے جا رہے ہیں۔

اب میرا ایوان میں بیٹھے رہنا بے کار تھا۔ جس شے کے مشاہدے کا شوق مجھے وہاں آدھی رات کو کھینچ لایا تھا، وہ میں نے دیکھ لی تھی۔ میں ایوان بنی سراج کے محرابی دروازے سے باہر صحن میں آ گیا۔ باہر رات کی تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ آسمان ستاروں سے بھرا ہوا تھا۔ خوب روشنی ہو رہی تھی۔

ایسے لگ رہا تھا جیسے کسی دلہن نے رات کی سیج پر اپنا سونے چاندی کا زیور سجا رکھا ہو۔ میں باہر جانے والے راستوں اور راہ داریوں سے واقف تھا۔ قصور الحمرا کے بڑے گیٹ تک مجھے کوئی چوکیدار نہ ملا۔ جب گیٹ کے پاس آیا تو گارڈ نے آگے بڑھ کر مجھ سے ہسپانوی زبان میں ظاہر ہے، یہی پوچھا کہ میں اس وقت کہاں سے آ رہا ہوں۔ میں نے جمائی لے کر ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہا کہ میں باغ میں درختوں کے نیچے سو گیا تھا۔

باوردی گارڈ نے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ پھر بڑے گیٹ کا چھوٹا دروازہ کھول دیا۔ میں قصر الحمرا سے باہر نکل گیا۔ اب میرے سامنے وہی مسئلہ تھا کہ اتنی رات گئے ہوسٹل میں واپس کیسے جاؤں گا۔ کیونکہ آخری بس وہاں سے رات کے گیارہ بجے چلی جاتی تھی۔ پارکنگ لاٹ خالی تھا۔ صرف ایک ویگن کونے میں کھڑی تھی۔ ریستوران بھی بند ہو چکا تھا۔ نشیب میں درختوں کے درمیان بل کھا کر جاتی سڑک سنسان پڑی تھی۔ ایک چوکیدار پارکنگ لاٹ کے سائبان کے نیچے پتھر کے بنچ پر کمبل اوڑھے سو رہا تھا۔ جب کوئی ذریعہ نظر نہ آیا تو میں پیدل ہی سڑک پر چل پڑا۔ بڑی طویل اترائی تھی۔ نیچے چوک میں آتے آتے مجھے ایک گھنٹہ لگ گیا۔

سڑک نشیبی تھی، اس لئے زیادہ تھکان محسوس نہ ہو رہی تھی۔ چوک بھی سنسان تھا۔ بس سٹاپ خالی پڑا تھا۔ یہاں لوکل بسیں اوپر جانے کے لئے آ کر ٹھہرتی تھیں۔ اس وقت کسی بس کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں بس سٹاپ کی چھت کے نیچے بنچ پر بیٹھ گیا۔ قصر الحمرا کی پہاڑی سے اترتے اترتے مجھے پسینہ آ گیا تھا۔ ٹھنڈی ہوا بڑی خوشگوار لگ رہی تھی۔ پہاڑی کی ڈھلان پر نیچے وادی تک آئے ہوئے مکانوں میں روشنیاں ہو رہی تھیں جو مجھے بڑی خوب صورت لگ رہی تھیں۔

سامنے چند قدموں کے فاصلے پر ایک پٹرول پمپ تھا جس کی بتیاں روشن تھیں۔ موٹر کے انجن کی آواز آئی۔ میں نے دائیں جانب دیکھا تو پاپولر کے درختوں والی سڑک پر سے ایک ٹرک آتا دکھائی دیا۔ وہ پٹرول پمپ پر آ کر رک گیا۔ ڈرائیور نے اتر کر کسی کو آواز دی۔ ایک لڑکا کیبن میں سے نکل کر دوڑتا ہوا آیا۔ ٹرک میں پٹرول ڈالا جانے لگا۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ ٹرک کا رخ شہر کی طرف ہے۔ یہ ٹرک مجھے شہر میں کچھ دور تک لے جا سکتا تھا۔ میں نے آگے جا کر ڈرائیور سے شکستہ انگریزی میں بات کی اور اسے کچھ اشاروں سے کچھ الفاظ سے سمجھایا کہ میں یونیورسٹی کیمپس جانا چاہتا ہوں۔ ڈرائیور گٹھے ہوئے جسم اور درمیانے قد کا جوان آدمی تھا۔ سر پر پی کیپ تھی۔ منہ میں سگار دیا ہوا تھا۔ میری بات سن کر منہ سے سگار نکال کر ہنسنے لگا۔ پھر بولا: ''کم۔

پھر بولا: ''کم۔ آئی گو یونیورسٹی کیمپس۔ کم۔''

میں اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ٹرک شہر کی کشادہ سڑکوں پر چل پڑا۔ سارا رستہ ڈرائیور کبھی شکستہ انگریزی اور کبھی ہسپانوی زبان میں خدا جانے مجھ سے کیا کیا باتیں کرتا رہا۔ کبھی اس کی بات سمجھ میں آ جاتی۔ میں اونگھنے لگا تھا۔ کچھ پتہ نہیں کتنی دیر تک میں ٹرک میں بیٹھا رہا اور ٹرک

کن کن بازاروں سے گزرا۔ اچانک ایک جگہ ٹرک رک گیا۔ میں اونگھتے ہوئے چونکا۔ ڈراوئر نے ہنس کر کہا: ''سینور! گو۔ یونیورسٹی کیمپس''۔

ٹرک یونیورسٹی کیمپس کے گیٹ کے سامنے کھڑا تھا۔ میں نے ڈرائیور کا شکریہ ادا کیا اور گیٹ میں سے گزرتا اپنے ہوسٹل میں آ گیا۔ چابی لگا کر کمرہ کھولا۔ دروازے کو اندر سے بند کیا اور اسی طرح بستر پر لیٹ گیا۔ بتی پہلے ہی سے بجھی ہوئی تھی۔ اس کے بعد مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔

دوسرے دن بلکہ اسی دن دوپہر کے وقت آنکھ کھلی۔ بستر پر بیٹھا رات کے واقعات پر غور کرنے لگا۔ رات میں نے بنی سراج کے ایوان میں جو کچھ دیکھا تھا، اس پر غور کرنے لگا۔ کیا یہ سب کچھ سچ تھا؟ کبھی یقین آتا، کبھی یقین نہیں آتا تھا۔ ہم میں سے اکثر لوگ یقین اور بے یقینی کی حالت میں ہی ساری زندگی گزار دیتے ہیں۔ کھڑکی میں سے دھوپ اندر آ رہی تھی۔ میں سگریٹ سلگا کر کھڑکی میں جھک کر باہر دیکھنے لگا۔ نیچے ہوسٹل کی چھوٹی سی سڑک پر کچھ ملکی طالب علم کتابیں اٹھائے تیز تیز قدموں سے گزر رہے تھے۔ سڑک کے پار گھاس کا کھلا میدان تھا، جہاں لڑکے فٹ بال کھیل رہے تھے۔ مجھے یاد آ گیا کہ سپین میں ہاکی اور فٹ بال بڑے مقبول کھیل ہیں۔ مجھے لاہور میں سپین اور پاکستان کے درمیان کھیلے جانے والے ہاکی کے میچ یاد آ گئے۔ سپین کی ٹیم ہر لحظہ بدلتی رہتی تھی۔ کبھی یہ بڑی مضبوط ٹیم بن جاتی اور جرمنی اور ہالینڈ ایسی ٹیموں کو ہرا دیتی اور کبھی روس ایسی کمزور ٹیم سے گول پر گول کھاتی چلی جاتی تھی۔ میدان کے پار یونیورسٹی کیمپس کی مورش انداز کی عمارت دھوپ چمک رہی تھی۔ اس کے پس منظر میں درد پہاڑی سلسلے کی چوٹیاں دھندلی دھندلی نظر آ رہی تھیں۔

میں نے کیمپس کی کینٹین میں آ کر ناشتہ کیا۔ ہسپانوی لڑکیاں اور لڑکے کینٹین میں

بیٹھے بڑی گرم جوشی سے باتیں بھی کر رہے تھے اور کافی وغیرہ سے بھی جی بہلا رہے تھے۔ ناشتہ میں نے ایسا کیا کہ مجھے اس کے بعد رات تک کھانے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اپنے کمرے میں آ کر دوبارہ سو گیا۔ ایسا سویا کہ رات کے دو بجے آنکھ کھلی۔ میں بالکل تازہ دم تھا۔ میں نے بتی روشن کر لی۔ سگریٹ لگا لیا اور اپنے اگلے سفر کا پروگرام سوچنے لگا۔ میرا پروگرام غرناطہ سے آگے کسی خانہ بدوش قبیلے کے ساتھ قرطبہ تک سفر کرنے کا تھا۔ اگرچہ مجھے سباطی نے کافی ڈرایا تھا اور ہسپانوی خانہ بدوشوں کے ساتھ سفر کرنے سے منع کیا تھا مگر میں یہ تجربہ ضرور کرنا چاہتا تھا۔ پھر زندگی جانے، یہ موقع ملے، نہ ملے۔ غرناطہ سے قرطبہ کی طرف جانے کے لئے شہر لوسینا سے ہو کر جانا پڑتا تھا۔ سباطی نے بتایا تھا کہ لوسینا ایک چھوٹا شہر ہے اور اس کے شمال مغرب میں چیڑھ کے درختوں سے لدی ہوئی ایک وادی ہے۔ اس وادی میں سے خانہ بدوشوں کے قافلے اکثر گزرا کرتے ہیں۔ اسکا مطلب تھا کہ مجھے لوسینا شہر کے مضافات سے ہی کوئی ہسپانوی خانہ بدوشوں کا قافلہ مل سکتا تھا۔ مجھ پر نیند کا غلبہ طاری ہونے لگا تھا۔ میں نے نقشہ تہہ کر کے بیگ میں ڈالا اور سگریٹ ایش ٹرے میں مسل کے کمبل اوپر کر کے دوبارہ سو گیا۔

دوسرے دن مجھے غرناطہ سے رخصت ہو جانا تھا۔

میں یونیورسٹی ہوسٹل کے وارڈن کے کمرے میں بیٹھا اس سے لوسینا شہر یعنی اپنی اگلی منزل کے بارے میں معلومات حاصل کر رہا تھا۔ یہ وارڈن وہی ہسپانوی تھا جو سباطی کا دوست تھا اور جس نے ہمیں ٹورسٹ ہوسٹل میں رہنے کو جگہ دی تھی۔ اس نے بتایا کہ لوسینا غرناطہ کے مغرب میں پہاڑی علاقے میں واقع ہے اور وہاں تک کوئی ٹرین نہیں جاتی۔

''دن میں صرف ایک ٹورسٹ بس صبح کے وقت جاتی ہے۔ اس کے بعد کل موٹریں ہیں جو آتی جاتی رہتی ہیں مگر ان کا کوئی وقت نہیں ہوتا''۔

اس نے مجھ سے پوچھا:

''سینور! تمہیں اگر قرطبہ جانا ہے تو غرناطہ سے ٹرین جہاناں شہر سے ہوتی ہوئی قرطبہ جاتی ہے، تم اس میں بیٹھ کر کیوں نہیں چلے جاتے۔ تھرڈ کلاس کا کرایہ زیادہ نہیں ہے''۔

میں نے اپنے میزبان کو نہیں بتایا تھا کہ میں لوسینا کی پہاڑیوں میں سفر کرتے کسی خانہ بدوش قافلے کس ساتھ قرطبہ تک سفر کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا:

''مگر سینور! میں ٹرین کے راستے سے سفر نہیں کرنا چاہتا۔ بس میں سفر کرنے سے مجھے جہاں چاہے اتر کر سیر و سیاحت کرنے کا موقع ملے گا''۔

''یہ تو تم نے ٹھیک کہا''۔ میزبان نے مسکراتے ہوئے کہا: ''پھر ایسا ہے کہ اس وقت دن کے نو بج رہے ہیں۔ لوسینا جانے والی ٹورسٹ بس تو نکل چکی ہوگی۔ میں تمہیں لوکل بس سٹاپ تک لئے چلتا ہوں۔ وہاں سے جس وقت لوسینا کی بس چلے تو اس میں سوار ہو جانا''۔

میزبان کی تجویز معقول تھی۔ تھوڑی دیر بعد میں اس کے ساتھ یونیورسٹی کی ویگن میں سوار ہو کر لوکل بس سٹینڈ کی طرف جا رہا تھا۔ یہاں دو تین پرانی بسیں کھڑی تھیں، جو بالکل خالی تھیں۔ معلوم ہوا کہ لوسینا جانے والی بس گیارہ بجے چلے گی۔ میرا میزبان مجھے وہاں چھوڑ کر چلا گیا۔

میں بس سٹینڈ کے بنچ پر بیٹھ کر سگریٹ پینے اور لوگوں کو ادھر ادھر آتے جاتے دیکھنے لگا۔ مجھے دو پونے دو گھنٹے انتظار کرنا پڑا۔ بڑی مشکل سے وقت گزارا۔ ایک بس، سٹینڈ سے نکل کر فٹ پاتھ والے شیڈ کے نیچے کھڑی ہوگئی۔ معلوم ہوا کہ یہی بس لوسینا جائے گی۔ میں نے ٹکٹ خریدا اور اس میں بیٹھ گیا۔ دوسرے مسافر بھی آنا شروع ہو گئے۔ ایک ادھیڑ عمر کا ہسپانوی مرغیوں کے ڈربے کے ساتھ بس کے اندر گھسنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ڈرائیور نے مرغیوں کے

ڈربے کو پکڑ کر بس سے باہر نکال دیا۔ دونوں میں تیز تیز فقروں کا تبادلہ شروع ہو گیا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ ڈرائیور مرغیوں کے ڈربے کو بس کی چھت پر رکھوانا چاہتا تھا مگر مرغیوں کا مالک ڈربے کو اپنے ساتھ بس کے اندر رکھنے پر اصرار کر رہا تھا۔ آخر مسافر کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔ مرغیوں کا ڈربہ بس کی چھت پر رکھوا دیا گیا۔ دیکھتے دیکھتے بس ہسپانوی مسافروں سے بھر گئی۔ ہر عمر کا مسافر اندر بیٹھا تھا۔ زیادہ تر مسافر دیہاتی اور میلے کچیلے کپڑوں والے تھے اور بڑے گھٹیا تمباکو والے سگریٹ پی رہے تھے۔ ایک موٹی عورت نے چلا کر ڈرائیور سے کچھ کہا۔ ڈرائیور نے اس آدمی کو ڈانٹ کر کچھ کہا جو موٹی عورت کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ اس نے اپنا سگریٹ باہر پھینک دیا۔ معلوم ہوا کہ وہ ہسپانوی کسان جو سگریٹ پی رہا تھا، اس کا دھواں سیدھا موٹی عورت کی ناک میں گھس رہا تھا۔

اس بس کا حال دیکھ کر مجھے پاکستان کی دیہاتی بسوں کا خیال آ گیا۔ ڈرائیور سٹینڈ کے کاؤنٹر پر کھڑا کافی پی رہا تھا۔ کنڈکٹر بس کے سامنے کھڑا لوسینا، لوسینا، لوسینا کا شور مچا رہا تھا۔ وہ لوسینا جانے والی سواریوں کو بلا رہا تھا۔ خدا خدا کر کے بس روانہ ہوئی۔ جب تک چھکڑا نما بس غرناطہ شہر اور مضافات کی پختہ سڑکوں پر رہی، بڑے آرام سے چلتی رہی۔ کوئی جھٹکے نہ لگے۔ لیکن جیسے ہی بس غرناطہ کے مضافات سے نکل کر لوسینا جانے والی نیم پہاڑی اور نیم پختہ سڑک پر آئی، اسے ہلکے ہلکے جھٹکے لگنے شروع ہو گئے۔ ہر جھٹکے پر مسافروں کے سر گاڑی کی چھت کی طرف اچھلتے اور چھت پر ڈربے میں بند مرغیاں شور مچانے لگتیں۔ سڑک کی حالت سخت خراب تھی۔ ساتھ ساتھ گرد بھی اڑتی تھی۔ میں اپنے آپ کو کوسنے لگا کہ ایسی بس میں سفر کرنے سے تو پیدل سفر کرنا زیادہ بہتر تھا۔ بیچ میں دو تین فرلانگ کا ٹکڑا ایسا آ جاتا کہ گاڑی بڑی صاف چلتی۔ اس کے بعد پھر جھٹکے لگنے شروع ہو جاتے۔ کوئی ایک گھنٹے کے بعد گاڑی ایک چھوٹے سے گاؤں

کے سٹاپ پر کھڑی ہوئی۔ لوگ پینی زبان میں خدا جانے کیا شور مچاتے گاڑی سے دھکم پیل کرتے اترے۔ میں بھی نیچے اتر آیا۔ یہ عجیب لوگ تھے۔ جب تک گاڑی کے اندر تھے، زندگی سے بیزار تھے اور ڈرائیور کی طرف ہاتھ بڑھا بڑھا کر اسے کوس رہے تھے۔ جونہی گاڑی سے اتر کر کھلی فضا میں آئے، ایک دوسرے سے ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگے۔

ڈرائیور سرخ رومال سے منہ پر اور بالوں پر پڑی ہوئی گرد صاف کرتا ریستوران کے باہر بچھی ہوئی میزوں پر لوگوں کے ساتھ بیٹھ گیا۔ سب مزے سے کھانے پینے میں مشغول ہو گئے۔ میں نے بھی وہاں بند قسم کی پھولی ہوئی میٹھی روٹی، سرخ مرچوں والی چٹنی کے ساتھ کھائی۔ چائے کی ایک پیالی پی اور سگریٹ سلگا کر ارد گرد پھیلی ہوئی بھوری اور سبز رنگ کی پہاڑیوں کو تکنے لگا۔ یہاں سبزہ بھی تھا اور بنجر علاقے اور بنجر پہاڑیاں ٹیلے بھی نظر آ رہے تھے۔ ہم لوسینا سے ابھی دور تھے۔ یہاں سے بس روانہ ہوئی تو سڑک ذرا ہموار شروع ہوئی اور گاڑی بڑے آرام سے چلنے لگی۔ راستے میں چھوٹے چھوٹے دیہات گزرتے رہے۔ ان دیہاتوں کے مکان سفید رنگ کے تھے۔ ہر مکان کی دیوار پر سفیدی پھری ہوئی تھی۔ کہیں کہیں ہرے بھرے کھیت بھی نظر آئے۔ ایک چھوٹے سے پل پر سے گاڑی گزری جس کے نیچے سے دریا گزر رہا تھا۔ دریا کا پاٹ پھیلا ہوا تھا اور اس کے شفاف پانی میں سے چھوٹے چھوٹے پتھر نظر آ رہے تھے۔ سڑک پہاڑی علاقے سے گزرنے لگی۔ جسکی وجہ سے گرد بہت کم اڑتی تھی۔ گاڑی کئی ایک پہاڑیوں کا چکر کاٹ کر ایک وسیع وادی میں داخل ہو گئی۔ یہاں بھرے کھیتوں اور اونچے اونچے سرو اور زیتون کے درختوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ کہیں کہیں کسی کارخانے کی چمنی بھی اوپر کو اٹھی نظر آ جاتی تھی۔ سڑک کے کنارے نیچے کچے راستے پر کبھی کوئی چارے سے لدا ہوا چھکڑا گزر جاتا تھا جس کے آگے خچر جتے ہوئے ہوتے تھے۔

معلوم ہوا کہ لوسینا شہر آ رہا ہے۔

یہ چھوٹا سا شہر تھا۔ بس ایک گنجان بس سٹینڈ کے اندر جا کر کھڑی ہو گئی۔ میں بھی دوسرے مسافروں کے ساتھ نیچے اترا۔ تھیلا میں نے ہاتھوں میں اٹھایا ہوا تھا۔ اس وقت دن ڈھل رہا تھا۔ موسم بڑا خوشگوار تھا۔ ایک میلے کچیلے کپڑوں والے سپینی مزدور نے آگے بڑھ کر میرا تھیلا اٹھانا چاہا۔ میں نے مسکرا کر نو تھینکس کہا اور تھیلا کاندھے پر لٹکا لیا۔

میں سٹینڈ کے اندر ہی ایک طرف بچھے ہوئے بنچ پر بیٹھ گیا اور اس بات پر غور کرنے لگا کہ مجھے رات کہاں بسر کرنی چاہیے۔ لوسینا کے تھرڈ کلاس ہوٹلوں کے متعلق مجھے میرے ہوسٹل والے میزبان نے بتایا تھا کہ وہاں مسافروں کے سامان اکثر چوری کر لیا جاتا ہے لیکن میں کسی مہنگے ہوٹل میں بھی نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ پرانے زمانے میں تو کارواں سراؤں میں مسافر رات بسر کر لیتے تھے لیکن یہ ماڈرن زمانہ تھا۔ اب کہیں کوئی کارواں سرائے بھی نہیں تھی۔ ایک گورے رنگ کا دبلا سا لڑکا میرے قریب سے گزرا تو میں نے اسے بلایا اور کچھ انگریزی کچھ سپینی زبان میں پوچھا کہ یہاں رات بسر کرنے کو کوئی مسافر خانہ نہیں ہے؟ لڑکا ہنس پڑا۔

''سینور! کپی تو۔ کپی تو''۔

اور چلا گیا۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا وہ کہہ گیا ہے۔ سامنے ایک سگریٹ کی چھوٹی سی لکڑی کی دکان تھی جس کے آگے شیشے کا دروازہ لگا تھا۔ اوپر امریکی سگرٹوں کا بڑا سا بورڈ لگا تھا۔ میں دکان کے اندر گیا۔ ایک سوکھی سی عورت گاہکوں کو ڈبے میں سے امریکی سگریٹ نکال کر دے رہی تھی۔ پھر وہ میری طرف متوجہ ہوئی:

''سینور!''

میں نے انگریزی میں پوچھا:

''یونو انگلش؟''

وہ ٹیڑھے میڑھے دانت نکال کر مسکرائی اور میز کے دراز میں ارتھ مین سگریٹ کا پیکٹ نکال کر میرے آگے رکھ دیا:

''سی سینور! انگلستانو''۔

یہ عورت میرا مسئلہ حل نہیں کر سکتی تھی۔ میں مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے دکان سے باہر نکلا تو پیچھے سے اس عورت کی ایسی تیز آواز آئی جیسے اپنی زبان میں مجھے گالیاں دے رہی ہو۔

آخر چائے کی چھوٹی سی دکان کے باہر بیٹھا ایک بوڑھا مل گیا جو انگریزی زبان تھوڑی بہت سمجھ بول لیتا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ لوسینا میں چھوٹے چھوٹے کئی ہوٹل ہیں مگر السفاریو ہوٹل ان سب میں قابل اعتبار ہے، وہاں کبھی کسی مسافر کا سامان وغیرہ چوری نہیں ہوا۔ میں نے بوڑھے سے السفاریو ہوٹل کا سارا پتہ معلوم کیا اور جاتے جاتے پوچھا:

''سینور! یہاں ہوٹلوں میں سامان چوری ہوتا ہے تو پولیس کچھ نہیں کرتی؟''

بوڑھا زور سے ہنسا۔ اس کے نچلے تین دانت غائب تھے۔ بولا:

''پولیسا نو! خود چوری کراتی ہے''۔

یعنی پولیس چوروں کے ساتھ ملی ہوئی ہوتی ہے۔ میں خاموشی سے آگے چل دیا۔

السفاریو ہوٹل شہر کے جنوبی علاقے میں ایک ٹیلے کے دامن میں بڑی سرسبز جگہ پر واقع تھا۔ دیکھنے میں وہ بوسیدہ سا ہوٹل تھا مگر اسکا گردوپیش بڑا خوب صورت اور فائیو سٹار ہوٹلوں والا تھا۔ آگے گھاس کا لان تھا۔ دائیں بائیں جانب درختوں کی قطاریں تھیں۔ عمارت کے برآمدے کی سیڑھیوں کے ساتھ ساتھ بھی پھولوں والے گملے رکھے ہوئے تھے۔ پتلے پتلے ستونوں پر سفید جنگلی گلاب کی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔

ہوٹل کے کاؤنٹر پر جو آدمی کھڑا تھا، اس نے بل فائٹروں والا لباس پہن رکھا تھا اور سگریٹ پی رہا تھا۔ وہ انگریزی بھی جانتا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ مجھے ہوٹل کی تیسری منزل پر کونے والا سب سے چھوٹا کمرہ سستے داموں مل جائے گا۔ پاکستان کرنسی کے حساب سے اس کمرے کا کرایہ پچاس روپے تھا اور یہ کوئی زیادہ کرایہ نہیں تھا۔ مجھے بھی وہاں کوئی زیادہ دن قیام نہیں کرنا تھا۔ میرا پروگرام تو صرف ایک رات بسر کرنے کا تھا۔ دوسرے روز علی الصبح مجھے لوسینا کی وادی میں کسی خانہ بدوش قبیلے کی تلاش میں نکل جانا تھا۔

میں نے سپینش کرنسی میں کمرے میں ایک رات بسر کرنے کی رقم ادا کر دی اور چابی لے کر دو دوسری منزل کے کونے والے کمرے میں آ گیا۔ دروازہ کھولا تو اندر کاٹھ کباڑ پڑا تھا۔ صرف ایک طرف کھڑکی کے پاس لوہے کا پلنگ بچھا تھا۔ ایک بوسیدہ سی چھوٹی میز اور کرسی ساتھ ہی پڑی تھی۔ میں نے اچھی طرح سے دیکھا۔ کمرے میں باتھ روم نہیں تھا۔ میں باہر نکل کر کسی بیرے وغیرہ کا انتظار کرنے لگا۔ اتنے میں ایک لڑکا ہاتھ میں چائے کی کیتلی پکڑے گیلری میں سے گزرا تو میں نے اسے بلا کر بڑی مشکل سے اسے سمجھاتے ہوئے پوچھا کہ یہاں باتھ روم کہاں ہے۔ لڑکے نے گیلری کے دوسرے کونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

''سی سینورا!''

اوپر والے کمروں کا کامن باتھ روم گیلری کے کونے میں تھا۔ خیر کیا کر سکتا تھا۔ تھیلا پلنگ پر رکھ کر صابن تولیہ نکالا اور کمرے کو تالا لگا کر باتھ روم کی طرف چلا۔ بڑا گندا باتھ روم تھا۔ جس طرح بھی ہو سکا، منہ ہاتھ دھویا۔ بالوں میں کنگھی پھیری۔ کمرے میں آ گیا۔ یہاں تھیلے میں سے دوسری جینز نکال کر پہنی۔ اس وقت سورج لوسینا کی مغربی پہاڑیوں کے پیچھے غروب ہو رہا تھا۔ میں سگریٹ سلگا کر کھڑکی کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔

نیچے نشیب میں درختوں کے جھنڈ دور تک چلے گئے تھے۔ بڑی خوش گوار ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی۔ ساری تکان دور ہوگئی۔ کمیں کمرے کو تالا لگا کر نیچے آ گیا۔ تھیلے میں سے پاسپورٹ اور پیسے نکال کر میں نے اپنی پتلون کی پچھلی جیب میں ڈال کر زپ لگا دی تھی تا کہ کوئی جیب کترا نہ لے اڑے۔ نیچے ہوٹل کے باہر برآمدے میں بانس کی کرسیاں میزیں لگی تھیں۔ ان پر لوگ بیٹھے کافی، چائے وائن وغیرہ پی رہے تھے۔ خوب اونچی اونچی آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ ایک خوب صورت لڑکی کالی واسکٹ پہنے بالوں میں گلاب کا پھول لگائے برآمدے میں سے گزری تو لوگ چپ ہو گئے اور لڑکی کو جاتے دیکھنے لگے۔ جب وہ گزر گئی تو ایک نوجوان نے اٹھ کر ڈانس کرنا شروع کر دیا۔ دوسرے لوگ تالیاں بجا بجا کر اولے اولے پکارنے لگے۔ خدا جانے یہ لڑکی کون تھی۔ ضرور کوئی ناچنے گانے والی ہوگی۔ کیونکہ میں نے وہاں کسی بھی جگہ اس طرح لوگوں کو لڑکیوں کی طرف گھورتے نہیں دیکھا تھا۔

راستے میں میں نے صرف ایک بند چٹنی کے ساتھ ہی کھایا تھا۔ چنانچہ سرِشام ہی مجھے بھوک محسوس ہونے لگی۔ میں نے ایکبیرے سے پوچھا کہ کھانے کو کیا کیا مل جائے گا۔ وہ میری انگریزی نہ سمجھ سکا۔ قریب بیٹھے ایک خوش پوش نوجوان نے اسے پسپانوی میں کچھ سمجھایا۔ بیرا اس نوجوان کو ہنستے ہوئے کچھ بتانے لگا۔ خوش پوش نوجوان نے مجھے انگریزی میں بتایا کہ اس ہوٹل میں زیادہ اچھا کھانا نہیں ملتا۔ لیکن میرا مشورہ ہے کہ تم آلو سلاد منگوالو۔ میں نے آلو سلاد کا ہی آرڈر دے دیا۔ خوش پوش نوجوان نے انگریزی میں مجھ سے پوچھا کہ میں کس ملک سے آیا ہوں۔ میں نے پاکستان کا نام لیا تو اس نے خوش ہو کر کہا:

''پاکستان۔ سی سی۔ تم سے مل کر بڑی خوشی ہوئی''۔

اس نے زبردستی مجھ سے ہاتھ ملایا اور کرسی کھینچ کر میرے قریب ہو گیا۔ میں اس سے

بے تکلف نہیں ہونا چاہتا تھا۔ کیونکہ کچھ پتہ نہیں تھا کہ وہ بعد میں کیا نکل آئے۔ میں بادل نخواستہ اس سے باتیں کرنے لگا۔ باتیں کیا کرنی تھیں، بس اس کے سوالوں کا جواب دیئے جاتا تھا۔ اس نے جیب سے امریکی سگریٹ کا پیکٹ نکال کر میری طرف بڑھایا۔ میں نے انکار کیا تو اس نے میرے کاندھے پر آہستہ سے ہاتھ مار کر کہا:

''سینور! اگر تم سگریٹ پیتے ہو تو پھر ہمیشہ امریکی سگریٹ پیا کرو۔

امریکانو! ونڈرفل۔۔۔ میں دو سال نیویارک میں گزار چکا ہوں''۔

اور پھر وہ نیویارک کی باتیں سنانے لگا کہ کس طرح اس نے ایک ہی وقت میں تین لڑکیوں نسے رومان شروع کر رکھا تھا۔ میں پریشان ہو گیا کہ یہ کیا مصیب میرے گلے پڑ گئی۔ اتنے میں لڑکا آلو سلاد اور ساتھ روٹی لے آیا۔ اب اٹھ بھی نہیں سکتا تھا۔ مجبوراً جلدی جلدی کھانا کھانے لگا۔ ساتھ ساتھ خوش پوش نوجوان کی باتوں کا ہوں ہاں میں جواب دیتا جاتا تھا۔ کھانا زہر مار کرنے کے بعد میں نے سگریٹ بھی نہ سلگایا اور اٹھ کھڑا ہوا اور خوش پوش نوجوان سے ہاتھ ملا کر کہا:

''سینور! تم سے مل کر بڑی خوشی ہوئی''۔

اس نوجوان نے میرا ہاتھ زور سے دباتے ہوئے کہا:

''میرا نام اونتونیو ہے''۔

پھر آنکھ مار کر بولا:

''کسی شے کی رات کو ضرورت ہو تو مجھے ضرور یاد کرنا۔ کمرہ نمبر ۲۱ بھول نہ جانا''۔

اور وہ مسکراتا ہوا اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔

میں اس کے مطلب کو سمجھ گیا تھا۔ اس قماش کے اکثر لوگوں سے میرا دوران سیاحت

واسطہ پڑ چکا تھا۔ اس قسم کے لوگ اکثر ہوٹلوں کے برآمدوں میں منڈلاتے ہوئے مل جاتے تھے۔ یہ میری لائن نہیں تھی۔ میں برآمدے کے کونے کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر دوسری منزل کی راہ داری میں آ گیا۔ میرا کمرہ کونے میں سب سے آخر میں تھا اور اسکا نمبر ۱۳ تھا۔ ایکدم سے مجھے خیال آیا کہ کمرہ نمبر ایکس بھی اسی منزل میں کہیں ہے۔ خیر ہوگا، مجھے اس سے کیا۔

میں نے تالا کھولا اور کمرے میں آ کر بتی جلائی۔ دروازہ بند کیا اور پلنگ پر بیٹھ کر مزے سے سگریٹ پینے لگا۔ کھلی کھڑکی میں سے تازہ اور خنک ہوا اندر آ رہی تھی۔ سگریٹ ختم کرنے کے بعد میں نے پلنگ کی پشت سے ٹیک لگا لی اور پلنگ پر ٹانگیں پھیلا کر سوچنے لگا کہ صبح خانہ بدوشوں کی تلاش میں مجھے کس طرف جانا چاہیے۔ راستوں کا تو مجھے پتہ نہیں تھا اور خانہ بدوشوں کا تو مجھے پتہ نہیں تھا اور خانہ بدوشوں کا کوئی ٹھکانہ بھی نہیں ہوتا۔ یہی سوچا کہ صبح صبح یہاں سے شمال مغرب کی طرف وادی میں چل پڑوں گا۔ کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی خانہ بدوش قافلہ مل ہی جائے گا۔ سباطی نے بھی اور میرے ہوسٹل والے میزبان دوست نے بھی مجھے بتا دیا تھا کہ لوسینا کے شمال مغرب کی جانب جو وادیاں، پہاڑیوں کے درمیان پھیلتی چلی گئی ہیں، ان وادیوں میں خانہ بدوشوں کے قافلے اکثر سفر کرتے دیکھے گئے ہیں۔ یہی ان کا روٹ ہوتا ہے۔ نقشے کے ذریعے مجھے یہ بھی علم ہو چکا تھا کہ لوسینا کا شہر غرناطہ اور قرطبہ کے درمیان واقع ہے۔ یعنی جتنی دور میں غرناطہ سے لوسینا آیا ہوں، اتنا ہی فاصلہ طے کرنے کے بعد میں قرطبہ پہنچ جاؤں گا۔ چنانچہ میں نے یہی سوچ رکھا تھا کہ میں وادیوں میں پیدل سفر کروں گا۔ اگر کوئی خانہ بدوش قافلہ مل گیا تو ٹھیک ہے، اگر نہ ملا تو میں آگے قرطبہ کی طرف نکل جاؤں گا۔

کھانا کھانے کے بعد خمار سا چڑھا۔ ویسے بھی بس کے سفر نے تھکا دیا تھا۔ ذرا آنکھ بند کی تو پھر ہوش نہ رہا۔ میں گہری نیند سو گیا۔ جب آنکھ کھلی تو کمرے کی بتی اسی طرح جل رہی

تھی۔ کلائی پر لگی ہوئی گھڑی دیکھی۔ بڑا حیران ہوا۔ گھڑی رات کا ایک بجا رہی تھی۔ پہلے یقین نہ آیا۔ جلدی سے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ باہر گیلری کی راہ داری میں آیا۔ واقعی باہر رات کا سناٹا طاری تھا اور لوسینا شہر کے ایک بازار میں سے کسی ٹرک کے گزرنے کی آواز آ رہی تھی۔ نیچے ہوٹل کے احاطے میں گہری خاموشی تھی۔ صرف ہوٹل کی پیشانی پر لگے بجلی کے بلب جل رہے تھے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی۔ آسمان پر کہیں کہیں تارے چمکتے دکھائی دیئے۔ ہوا میں خنکی اور رطوبت تھی۔ میں کمرے میں آ کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔ نیند بالکل غائب تھی۔ جیسے نیند پوری ہو چکی تھی۔ بوٹ اتار دیئے۔ پلنگ پر لیٹ کر کمبل اوپر کر لیا۔ بتی میں نے نہیں بجھائی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ مگر نیند ایسے غائب ہو گئی تھی جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ مجھے پیاس محسوس ہوئی۔ پانی میں گیلری کے کونے والے باتھ روم کے نلکے سے ہی جا کر پی سکتا تھا۔ کمبل پرے ہٹا کر میں اٹھا اور کمرے سے نکل کر گیلری کی راہ داری میں آ گیا۔ راہ داری میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بجلی کے بلب روشن تھے۔ میں باتھ روم کی طرف چلنے لگا۔ گیلری خالی تھی۔ یونہی میں کمروں کے باہر لگے ہوئے نمبر پڑھنے لگا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ کمرہ نمبر ۲۱ کون سا ہے جہاں وہ خوش پوش نوجوان رہائش پذیر ہے جس نے مجھے رات رومانوی انداز میں بسر کرنے کی دعوت دی تھی۔ سترہ نمبر کمرہ گزر گیا۔ پھر اٹھارہ نمبر، پھر انیس نمبر، بیس اور پھر ۲۱ نمبر دروازہ تھوڑا سا کھلا تھا اور اندر سے دو آدمیوں کے تیز تیز بولنے کی آواز آ رہی تھی۔

میں نے تھوڑے سے کھلے دروازے کی جھری میں سے جھانک کر دیکھا۔ یہ میرے کمرے سے ذرا بڑا کمرہ تھا۔ وہی خوش پوش نوجوان جس نے اپنا نام اونتو نیو بتایا تھا، سلیپنگ سوٹ میں ملبوس کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے میری طرف پیٹھ کئے ایک بھاری جسم اور سیاہ گھنگھریالے بالوں والا آدمی میز پر ہاتھ رکھے ذرا آگے جھک کر بیٹھا تھا اور ہسپانوی زبان میں

غصے کے عالم میں اونتونیو کو کچھ کہہ رہا تھا۔

اونتونیو نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کچھ کہا۔ اس پر گھنگھریالے بالوں اور سیاہ واسکٹ والا آدمی جیسے طیش میں آ کر ایکدم اٹھا اور جنگلی بلے کی طرح اونتونیو پر جھپٹا۔ اسکی کرسی پیچھے کو گر پڑی۔ اس نے اتنی تیزی سے اونتونیو کی گردن کو دونوں ہاتھوں میں جکڑ لیا کہ اونتو ہاتھ پاؤں مارتا ہی رہ گیا۔ ویسے بھی گھنگھریالے بالوں والا آدمی اونتونیو کے مقابلے میں طاقت ور اور مضبوط جسم کا مالک تھا۔ اونتونیو اس کے ساتھ ہی کرسی سے نیچے گر پڑا تھا۔ اسکا گلا پوری طاقت سے دبایا جا رہا تھا۔ میرے دیکھتے دیکھتے اونتونیو بے حس و حرکت ہو گیا۔ گھنگھریالے بالوں والے آدمی نے دو تین بار اونتونیو کی گردن کو زوردار جھٹکے دیئے۔ پھر اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر دیکھا۔ میں اس آدمی کی جرأت پر حیران تھا کہ اس نے دروازہ بھی بند نہیں کیا تھا اور بڑے اطمینان سے ایک آدمی کو قتل کر رہا تھا۔

جب گھنگھریالے بالوں والے کو یقین ہو گیا کہ اونتونیو مر چکا ہے تو اس نے اپنی سیاہ پتلون کی جیب میں سے سرخ رومال نکال کر اپنا منہ پونچھا۔ رومال کو اپنے گلے میں باندھا۔ کرسی کو لات مار کر پرے گرایا اور دروازے کی طرف مڑا۔

میں نے اپنی آنکھوں سے ایک نوجوان کو قتل ہوتے دیکھا تھا اور مجھ پر جیسے سکتہ سا طاری ہو گیا تھا۔ جیسے ہی گھنگھریالے بالوں والا قاتل دروازے کی طرف مڑا۔ میں تیزی سے پنجوں کے بل چلتا آگے چلا گیا۔ باتھ روم سامنے ہی تھا۔ باتھ روم میں گھس کر میں نے دروازہ بند کر کے اندر سے کنڈی لگا لی اور تالے کے سوراخ میں سے گیلری کی راہ داری کو دیکھنے لگا۔ گھنگھریالے بالوں والا آدمی کمرہ نمبر ۲۱ میں سے نکل آیا۔ گیلری کی سیڑھیاں باتھ کے ساتھ ہی نیچے پہلی منزل کو جاتی تھیں۔ پہلے میرا خیال تھا کہ شاید وہ باتھ روم کی طرف آ رہا ہے۔ مگر وہ باتھ

روم کے قریب سے ہو کر سیڑھیوں کی طرف چلا گیا۔ راہ داری میں جو بلب روشن تھے، اس کی روشنی میں مجھے گھنگھریالے بالوں والے آدمی کا چہرہ صاف نظر آ گیا تھا۔

اس کا جبڑا چوڑا، سر بڑا اور ناک تیکھا تھا۔ داڑھی صاف تھی۔ اس نے نسواری واسکٹ اور نیلی جینز پہنی ہوئی تھی جو میلی کچیلی ہو رہی تھی۔ جب یہ قاتل باتھ روم کے قریب سے گزرا تو میرے دل کی دھڑکن ایک لمحے کے لئے تیز ہو گئی تھی۔ خوف کے مارے میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ میں نے جلدی سے نلکا کھول کر پانی کے تین چار گھونٹ پیے۔ طبیعت ذرا سنبھلی تو میں باتھ روم کی کنڈی کھول کر راہ داری میں آ گیا۔ جب میں کمرہ نمبر ۲۱ کے قریب سے گزرا تو میرے دل کی دھڑکن ایک بار پھر تیز ہو گئی۔

میرے دل میں زبردست خواہش پیدا ہوئی کہ میں کمرے میں جا کر دیکھوں کہ خوش پوش نوجوان اونتونیو مر گیا ہے یا ابھی زندہ ہے۔ مگر اس خیال سے کہ دروازہ کھولا تو وہاں میری انگلیوں کے نشان پڑ جائیں گے اور کہیں میں پکڑا نہ جاؤں۔ میں تیز تیز قدموں سے آگے نکل گیا۔ اپنے کمرے میں جا کر دروازہ بند کر کے کنڈی لگا لی۔ بتی بجھا دی اور پلنگ پر لیٹ کر کھلی آنکھوں سے اندھیرے میں آنکھیں جھپک جھپک کر دیکھنے لگا۔ انتونیو کے قتل کا منظر اور گھنگھریالے بالوں والے قاتل کی شکل بار بار میری آنکھوں کے سامنے آ رہی تھی۔ اس خیال سے میری نیند بالکل ہی اڑ گئی تھی کہ میرے کمرے سے چند کمرے چھوڑ کر کمرہ نمبر ۲۱ میں ایک نوجوان کی لاش پڑی ہے۔ مجھے یقین تھا کہ اونتونیو مر چکا ہے۔

اگر وہ زندہ ہوتا تو ضرور کسی نہ کسی طرح گرتا پڑتا کمرے سے باہر نکل کر لوگوں کو مدد کے لئے بلاتا۔

اسی طرح جاگتے جاگتے صبح ہو گئی۔ کھلی کھڑکی میں سے دن کا اجالا اندر آنے لگا۔ میں

خوف کے مارے باہر نہیں نکل رہا تھا۔ میں اس انتظار میں تھا کہ ہوٹل کا کوئی ملازم لاش کو دیکھ کر شور مچائے تو میں بھی دوسرے لوگوں کے ساتھ کمرے سے باہر آ جاؤں۔ مجھے معلوم تھا کہ ان علاقوں کے شہروں میں بیڈ ٹی پینے کا بڑا رواج ہے اور کوئی نہ کوئی ہوٹل کا ملازم اونتونیو کے لئے بیڈ ٹی لے کر ضرور آئے گا۔ میرے کان باہر گیلری کی طرف لگے ہوئے تھے۔ ابھی تک باہر سے کوئی آواز نہیں آئی تھی۔ لگتا تھا کہ کمرے کے سارے مسافر گھوڑے بیچ کر سوئے ہوئے ہیں۔

میں نے گھڑی دیکھی، سویرے کے پونے چھ بج رہے تھے۔ میں بڑی بے چینی اور بے صبری سے گیلری میں بلند ہونے والی چیخ کی آواز کا انتظار کر رہا تھا۔ میں اٹھ کر کرسی پر بیٹھ گیا اور سگریٹ سلگا کر پینے لگا۔ پھر میں نے کھڑکی میں سے جھانک کر نیچے دیکھا۔ یہ ہوٹل کا عقبی حصہ تھا اور ادھر سوائے نشیب میں دور تک گئے ہوئے درختوں کے اور کچھ نہیں تھا۔ میں کھڑکی سے ہٹ ہی رہا تھا کہ اچانک گیلری میں شور اٹھا۔ میں یوں خوش ہوا جیسے بارات آ گئی ہو۔ دوڑ کر دروازہ کھولا اور گیلری میں آ گیا۔ گلری میں کمرہ نمبر ۲۱ کے باہر لوگ کھڑے تیز تیز باتیں کر رہے تھے۔ ایک آدمی گیلری کی کارنس سے جھک کر نیچے کسی کو پکار رہا تھا۔ نیچے سے بھی لوگ اوپر آ گئے۔ ان میں ہوٹل کا مالک بھی تھا۔ وہ کمرے کے اندر چلا گیا۔ باقی لوگ باہر کھڑے خوف زدہ نظروں سے کمرے کے اندر دیکھ رہے تھے۔ میں اپنے کمرے کے باہر ہی کھڑا تھا۔ پھر میں بھی ان لوگوں کے پاس چلا گیا۔ ایک آدمی سے انگریزی میں پوچھا:

''کیا ہو گیا ہے؟''

اس نے میری طرف دیکھے بغیر جیسے بڑبڑاتے ہوئے کہا:

''مرڈر۔۔۔ مرڈر۔۔۔''

ہوٹل کا مالک دونوں ہاتھوں سے لوگوں کو کمرے سے باہر نکالتے ہوئے خود بھی باہر آ

گیا اور اس نے دروازہ بند کر دیا۔ وہ چلا چلا کر سب کو اپنے کمروں کی طرف جانے کے لئے کہہ رہا تھا۔ اتنی اتنی ہسپانوی زبان اب میں سمجھنے لگا تھا۔ نیچے ہوٹل میں سے پولیس کو فون کر دیا گیا تھا۔

مگر پولیس کا کہیں دور دور تک نام و نشان تک نہیں تھا۔ ہوٹل کا مالک کمرہ نمبر ۲۱ کے باہر اپنے تین ملازموں کے ساتھ کرسیاں ڈال کر بیٹھا تھا۔ یہ لوگ شاید پولیس کا انتظار کر رہے تھے۔ میں افسوس ناک شکل بنائے ان کے قریب سے گزر کر سیڑھیاں اتر کر نیچے ہوٹل کے برآمدے میں آ کر بیٹھ گیا۔ یہاں بھی ایک دہشت کی فضا طاری تھی۔ سب لوگ آپس میں چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ میں نے ایک بیرے کو آواز دے کر بلایا۔ اس نے سنی ان سنی کر دی۔ ایک دوسرا ادھیڑ عمر بڑی بڑی مونچھوں والا بیرا میرے قریب سے گزرا تو میں نے اسے ناشتہ لانے کے لئے کہا۔ بیرے میں مجھ پر ایک نگاہ غضب ناک مجھ پر ڈالی اور سر ہلا کر پسینی زبان میں کہا:

''سی سینور!''

یعنی اچھا سینور یا ٹھیک ہے سینور۔

سارے علاقے میں خبر پھیل گئی تھی کہ ہوٹل میں ایک آدمی قتل ہو گیا ہے۔ لوگ ہوٹل کے باہر اکٹھے ہو گئے تھے۔ جو لوگ ہوٹل میں مقیم تھے وہ بھی نیچے برآمدہ میں آ کر ایک دوسرے سے سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ دولڑکے بادل نخواستہ میزوں پر ناشتہ لگا رہے تھے۔ میری میز پر بھی ناشتہ رکھ دیا گیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس سارے ہوٹل میں ان سارے لوگوں میں سے کسی کو پتہ نہیں کہ میں نے قاتل کو دیکھ لیا ہے۔ میں نے وہاں سے ناشتے کے بعد نکل جانے کا پروگرام بنا لیا تھا۔ میں اس قتل کا عینی شاہد تھا مگر مجھے کسی کو بتانے کی کوئی ضرورت نہیں

تھی۔ میں خاموشی سے ناشتہ کرنے لگا۔ اتنے میں پولیس کی ایک گاڑی سائرن بجاتی آ گئی۔ وردی پوش سپاہی ایک انسپکٹر کے ساتھ اتر کر سیدھے ہوٹل میں آ گئے۔ ہوٹل کا مالک اور مینجر ان کے خیر مقدم کے لئے دوسری منزل سے نیچے اتر آئے تھے۔ وہ سپینی زبان میں باتیں کرنے لگے۔ پھر پولیس اوپر چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد خوش پوش نوجوان اونتونیو کی لاش سٹریچر پر ڈال کر نیچے لائی گئی۔ لاش چادر سے پوری طرح ڈھکی ہوئی تھی۔ کافی لوگ لاش کے ساتھ ایمبولینس تک گئے۔ جب تک ایمبولینس چلی نہیں گئی، لوگ وہاں سے بالکل نہ ہلے۔ پولیس اوپر مقتول کے کمرے میں ہی تھی۔ میں ناشتہ کرنے کے بعد اوپر گیا تو دیکھا کہ پولیس کا ایک آدمی دروازوں پر سے انگلیوں کے نشان اتار رہا تھا۔ میں خاموشی سے سر جھکائے وہاں سے گزر گیا۔ اپنے کمرے میں آ کر میں نے اپنا سفری تھیلا چیک کیا۔ اس میں اپنی چیزیں سنبھال کر رکھیں اور کاندھے پر ڈال کر گیلری کی راہ داری میں سے گزرتا ہوا سیڑھیوں کی طرف آیا۔

مقتول کے کمرے کے باہر انسپکٹر ہوٹل کے مالک کے ساتھ کرسی پر بیٹھا کافی پی رہا تھا اور ہوٹل کے مالک سے باتیں کر رہا تھا۔ میں ان کے قریب سے گزرا تو انسپکٹر نے مجھے رکنے کا اشارہ کیا اور سپینی زبان میں کچھ کہا۔ ہوٹل کے مینجر نے اسکا ترجمہ انگریزی میں کیا۔ انسپکٹر نے مجھ سے پوچھا تھا کہ میں کون ہوں؟ میں نے انگریزی میں ہی جواب دیا کہ پاکستان کا ٹورسٹ ہوں۔ کل یہاں آیا تھا، اب آگے سیاحت کے لئے قرطبہ جا رہا ہوں۔

انسپکٹر نے اب انگریزی میں پوچھا:

''تم نے رات کو کوئی آوازیں سنی تھیں؟''

میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا:

''نوسینور! میں نے کوئی آواز نہیں سنی۔ میں سو رہا تھا''

انسپکٹر نے کافی کی پیالی میز پر رکھی اور کہا:

''مجھے اپنا پاسپورٹ دکھاؤ گے؟''

میں نے پتلون کی جیب میں سے پاسپورٹ نکال کر اسے دے دیا۔ سپینش انسپکٹر میرے پاسپورٹ کے ورق الٹ کر بڑے غور سے دیکھنے لگا۔ پھر اس نے پاسپورٹ مجھے دیتے ہوئے کہا:

''تم جا سکتے ہو سینور''

میں نیچے آ گیا۔ دل میں، میں سوچ رہا تھا کہ اگر انسپکٹر کو یہ معلوم ہو جائے کہ میں اس قتل کا عینی شاہد ہوں اور میں نے قاتل کو بڑے غور سے دیکھا ہے تو وہ مجھے لوسینا سے کبھی نہ جانے دے۔ نیچے ہوٹل کے کاؤنٹر پر کلرک کو جا کر میں نے اطلاع کی کہ میں جا رہا ہوں۔ ہوٹل میں رات بھر کا کرایہ میں نے آتے ہی ادا کر دیا تھا۔ کھانے پینے کا بل وہاں ساتھ ساتھ لے لیا جاتا تھا۔ کلرک نے رجسٹر کھول کر ایک جگہ میرے دستخط کرائے اور مسکرا کر کہا:

''سینور! تمہارا شکریہ''

میں بس سٹینڈ کی طرح چل پڑا۔ مجھے خوش پوش نوجوان اونتونیو کے قتل کا بڑا افسوس تھا۔ مگر جس قسم کا دھندا اونتونیو کرتا تھا، اس میں ایسا ہو جایا کرتا ہے۔

دن کافی نکل آیا تھا۔ بس سٹینڈ پر کچھ مسافر پہلے سے بیٹھے تھے۔ میں نے بکنگ کلرک کی کھڑکی میں جھک کر پوچھا کہ قرطبہ جانے والی بس کب روانہ ہو گی۔ بکنگ کلرک ٹکٹوں پر مہریں لگا رہا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا:

''نوسینور''

میں نے پوچھا:

''کیا قرطبہ کی بسیں یہاں سے نہیں چلتیں؟''

کلرک نے ٹکٹوں کی گڈی ایک طرف رکھ دی اور کھڑکی میں سے میری طرف دیکھ کر کہنے لگا:

''قرطبہ کو یہاں سے سیدھی بس کوئی نہیں جاتی، بلنسیا تک ہماری بسیں جاتی ہیں۔ آگے دریا کا نیا پل بن رہا ہے، ہماری بسیں وہاں سے واپس آ جاتی ہیں''۔

میں نے سوال کیا: ''کیا بلنسیا سے قرطبہ جانے والی کوئی بس مل جائے گی؟''

''سی سینور مل جائے گی''۔

میں نے بلنسیا تک کا ٹکٹ لیا اور دوسرے مسافروں کے پاس آ کر بیٹھ گیا اور بس کا انتظار کرنے لگا۔ یہ بس غرناطہ سے آنے والی تھی۔ کوئی پون گھنٹہ گذر گیا۔ پھر مطلوبہ بس کھڑکھڑاتی ہوئی بس سٹینڈ کی طرف آتی دکھائی دی۔ دوسرے مسافر اٹھ کھڑے ہوئے۔ کچھ لوگ بس کی طرف دوڑ پڑے۔ شاید اس خیال سے کہ جیسے کوئی مسافر اترے تو اس کی سیٹ پر قبضہ جما لیں۔ بس پہلے سے ہی بھری ہوئی تھی۔ سٹینڈ پر کھڑی ہوئی تو بڑی مشکل سے اندر کی سواریاں باہر نکلیں۔ دیکھتے دیکھتے بس بھر گئی۔ یہ بس غرناطہ سے لوسینا تک آنے والی چھکڑا نما بسوں سے ذرا بہتر تھی۔ کھڑکیوں کے سارے شیشے سلامت تھے۔ مجھے بھی بس کے پیچھے ایک سیٹ مل گئی۔

میرا پروگرام یہ تھا کہ لوسینا اور بلنسیا کے درمیان کسی بھی جگہ اتر جاؤں گا اور وہاں سے خانہ بدوشوں کے قافلے کی تلاش شروع کر دوں گا۔ کافی دیر رکنے کے بعد بس بلنسیا کی جانب روانہ ہوئی۔ جیسے جیسے بس آگے بلنسیا اور قرطبہ کی طرف جا رہی تھی، علاقہ پہاڑی اور سرسبز ہوتا جا

رہا تھا۔ بھورے رنگ کے خشک ٹیلے ختم ہوتے جا رہے تھے۔ کوئی ایک گھنٹے کے سفر کے بعد بس ایک مرغ زار میں داخل ہوگئی۔ جگہ جگہ وادیوں میں زیتون، انجیر اور مالٹوں کے باغات تھے۔ ہری بھری شاداب پہاڑوں کی ڈھلانوں پر درختوں کے جھنڈ نظر آ رہے تھے۔ ہر پہاڑی پر کوئی نہ کوئی گرجا بنا ہوا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ مسلمانوں کے دور میں یہاں مسجدیں ہوتی ہوں گی۔ سباطی نے مجھے بتایا تھا کہ مسلمانوں کے سیاسی زوال کے بعد عیسائی حکمرانوں نے عربوں کی بنائی ہوئی اکثر مسجدوں کو شہید کر دیا تھا۔ جو مسجدیں بڑی تھیں، انہیں گرجا گھروں میں تبدیل کر دیا تھا۔

میں نے اب تک سپین میں جتنا سفر کیا تھا اور جہاں جہاں سے گزرا تھا، مجھے کہیں کوئی مسجد نظر نہیں آئی تھی۔ یہ سرسبز ہرا بھرا علاقہ مجھے بہت اچھا لگا۔ بس ایک دریا کے پل پر سے گزر رہی تھی۔ پل زیادہ بڑا نہیں تھا۔ ہسپانیہ میں شاید ہی کوئی ایسا شہر ہوگا جس کے قریب سے یا تھوڑے فاصلے پر سے کوئی دریا یا بڑی نہر نہ گزرتی ہو۔

بس دریا کا پل پار کرنے کے بعد ایک قصبے کے بس سٹینڈ پر آ کر رک گئی۔ اس قصبے کا نام القصبہ تھا۔ یہ ''ال'' کا سابقہ عربوں کی دین تھی۔ سپین میں اس قسم کے عربی سابقے والے نام جگہ جگہ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ میں یہاں اتر گیا۔ میں نے القصبہ سے خانہ بدوش قبیلے کی تلاش شروع کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں ایک چھوٹے سے دکان نما ہوٹل کے پیچھے سے ہو کر مکئی کے کھیت کے پاس آ کر پہاڑیوں اور باغات کا نظارہ کرنے لگا۔ یہاں آنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ ڈرائیور مجھے نہ دیکھے اور مجھے ہارن دے کر بلانے کی بجائے آگے روانہ ہو جائے۔

ایسا ہی ہوا۔ تھوڑی دیر رکنے کے بعد بس میرے بغیر ہی آگے چل پڑی۔ میں دکان نما ہوٹل کے باہر بچھی میز کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ ایک لڑکا دوڑ کر میرے پاس آیا اور اسپینی میں بولا:

''سینورا! کیا لاؤں؟''

اب میں کچھ کچھ سپینی زبان سمجھنے لگا تھا اور بولنے کی کوشش بھی کر لیتا تھا۔ اس لڑکے نے مجھے سینورا کہا تھا جبکہ مہذب سوسائٹی میں دوسرے کو سینور کہہ کر بلایا جاتا ہے۔ سینورا عام طور پر ان پڑھ اور دیہاتی لوگ کہتے ہیں۔ میں نے اپنا تھیلا میز پر رکھ دیا اور پتلون کی جیب سے سگریٹ نکالتے ہوئے لڑکے سے اسپینی زبان میں کہا:

''کیا تم لوگ مرغی چاول پکاتے ہو؟''

لڑکا عجیب نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ وہ میری ادھوری اسپینی زبان پوری طرح نہ سمجھ سکا تھا۔ میں نے اپنے جملے کو مختصر کرتے ہوئے صرف دو لفظ بولے:

''مرغی، چاول''

ان چیزوں کے سپینی الفاظ مجھے معلوم تھے۔ لڑکے نے ہنس کر کہا:

''نو سینورا۔۔نو۔۔''

پھر اس نے انگلیوں پر دو تین کھانے گنوائے جن میں سلاد، بن بھی تھا۔ بن کو ہمارے ہاں بند بولتے ہیں۔ جیسے بند مکھن۔ اس لفظ کی اصل عربی لفظ من ہے۔ اس سے من وسلوا بنا ہے۔ اس کے معنی گیہوں کے گندھے ہوئے آٹے کے ہیں۔ فرانس میں یہ لفظ بن کی شکل اختیار کر گیا۔ اسپین میں یہ لفظ بن ڈبل روٹی اور گول روٹی کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ میں نے سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے اسپینی لڑکے سے کہا: ''سی سینورا۔۔۔بن''

لڑکا ہنستے ہوئے کپڑے سے میز پونچھ کر چلا گیا۔ سڑک سے ہٹ کر ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جس کے کچے پکے مکان ٹیلے کی ڈھلان پر نیچے وادی تک آئے ہوئے تھے۔ سب مکانوں پر سفیدی پھری ہوئی تھی اور دوپہر کی دھوپ میں چمک رہے تھے۔ گاؤں کے جو لوگ

وہاں نظر آئے، وہ مفلوک الحال لگتے تھے۔ لڑکا میرے لئے مرغی کا سالن اور بن لے کر آ گیا۔ مرغ کے سالن میں کافی مرچیں تھیں مگر بڑا مزے دار تھا۔ میں نے کھانے کے بعد کافی منگوائی اور سوچنے لگا کہ کس طرف سے اپنا پیدل سفر شروع کیا جائے۔

میں کافی کا آخری گھونٹ پی رہا تھا کہ میرے ساتھ والی میز پر ایک کٹے ہوئے مردانہ فیشن کے گولڈن بالوں والی گوری چٹی عورت آ کر بیٹھ گئی اس نے گھٹنوں سے پھٹی ہوئی میلی کچیلی جینز کے اوپر اسی رنگ کی پرانی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے پاس بھی سفری تھیلا تھا جو اس نے بیٹھنے سے پہلے میز پر رکھ دیا تھا۔ وہ نسواری رنگ کا پتلا سگریٹ پی رہی تھی۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ یورپ کے کسی ملک کی ٹورسٹ ہے اور سپین کی سیر و سیاحت کو نکلی ہوئی ہے۔ اس قسم کی کئی سیاح عورتیں اور مرد میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ اس نے لڑکے کو اشارے سے غبلا کر اسپینی زبان میں کافی اور سینڈوچ لانے کو کہا۔ پھر بیگ میں سے چھوٹا سا نقشہ نکال کر دیکھنے لگی۔ میں نے سوچا کہ اس عورت سے نقشہ لے کر اپنے اگلے پیدل سفر کا تعین کرنا چاہیے۔ میں انتظار کرنے لگا کہ وہ نقشہ دیکھ کر فارغ ہو تو میں اس سے نقشہ مانگوں۔

اسکی شکل واجبی سی تھی۔ جوانی کی عمر سے گزر چکی تھی مگر یورپی عورتوں کی طرح چاق و چوبند تھی۔ میں نے کمینگی سے کام لیتے ہوئے کنکھیوں سے اس کو دیکھا۔ کنپٹیوں کے قریب گولڈن بال ذرا ذرا سفید ہو رہے تھے۔ وہ سر جھکا کر بڑے غور سے نقشہ دیکھ رہی تھی۔ اس دوران میں سگریٹ پینے لگا۔ لڑکا کافی کا مگ اور سینڈوچز کی پلیٹ لے کر آ گیا۔ ٹورسٹ عورت نے نقشہ بند کر کے تھیلے کے پاس ہی میز پر رکھ دیا۔ یہ کاپی سائز کا کاغذ جتنا نقشہ تھا، جس پر پلاسٹک کی شیٹ چڑھی ہوئی تھی۔ ٹورسٹ عورت سینڈوچ کھانے اور ساتھ ساتھ کافی کے مگ میں چمچ ہلانے لگی۔ اس دوران ہماری نگاہیں چار ہوئیں تو وہ یورپ کے رواج کے مطابق ذرا سی

مسکرادی۔ میں بھی مسکرادیا۔ میں اٹھ کر اس کے قریب گیا اور انگریزی میں کہا: ''میں نقشہ دیکھ سکتا ہوں''۔

عورت نے بڑی خندہ پیشانی سے کہا:

''ضرور، ضرور۔ تم بھی مجھے سیاح لگتے ہو، کیا انڈیا کے ہو؟''

اسکی انگریزی بڑی صاف، رواں اور انگریزوں ایسی تھی۔ اس کے لہجے سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ انگلستان کی رہنے والی ہے۔ میں نے نقشہ اٹھا کر اسے کھولتے ہوئے کہا:

''نو میڈم میں پاکستان سے آیا ہوں''۔

''اوہ آئی سی۔۔۔ تم اپنی کرسی ادھر لے آؤ، کافی پینا پسند کرو گے''۔

میں کرسی کے ساتھ اپنا تھیلا بھی لے کر وہیں اس کے پاس آ گیا۔ مگر انگریزوں جیسے تکلف کے ساتھ کہا:

''کہیں میں آپ کی تنہائی میں تو مخل نہیں ہوں گا؟''

''اونو نو۔ ٹورسٹ کی کوئی تنہائی نہیں ہوتی''۔

وہ ہنس کر بولی۔ اس کی آنکھیں اکثر انگریز عورتوں کی طرح بھوری تھیں۔ وہ جب ہنسی تو مجھے اس کے دانت نظر آئے جو اتنے سفید نہیں تھے۔ اسکی جیکٹ کا گریبان کھلا تھا۔ اندر اس نے نیلے رنگ کی مردانہ قمیص پہن رکھی تھی۔ قمیص کے اوپر کے دو بٹن بھی کھلے تھے۔ اس کے چہرے پر تل بھی تھے۔ ناک اوپر کو اٹھی ہوئی تھی۔

میں نقشہ دیکھ رہا تھا۔ نقشے کا مجھے کوئی سر پیر نہیں مل رہا تھا۔ وہ سمجھ گئی۔ کہنے لگی۔

''تم کیا دیکھنا چاہتے ہو؟''

میں نے نقشہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا:

''میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں میڈم کہ ہم اس وقت جہاں بیٹھے ہیں، یہ جگہ نقشے میں کہاں ہے؟''

وہ ہنسنے لگی۔ اس نے نقشہ میرے ہاتھ سے لے لیا۔ پھر ایک جگہ پر اپنے میلے ناخنوں والی پتلی لمبی انگلی رکھ کر بولی:

''ہم یہاں ہیں۔ یہاں اس گاؤں کا نام نہیں دیا گیا۔ مگر غرناطہ اور قرطبہ کے درمیان یہی جگہ ہے جہاں ہم بیٹھے ہیں۔ میں اس نقشے کے حساب سے ہی سفر کر رہی ہوں''۔

میں غور سے نقشے کو دیکھنے لگا۔ اس عورت نے سینڈوچ ختم کر دیا تھا۔ کافی کا بھی آخری گھونٹ پی گئی۔ اس نے تھیلے میں سے نسواری رنگ کے پتلے سگرٹوں کا پیکٹ نکال کر کھولا اور میری طرف بڑھا کر بولی:

''یہ سگریٹ ٹرائی کرو گے؟''

میں نے اپنا سگریٹ پھینک کر اس کی ڈبی میں سے سگریٹ نکال لیا۔ یہ سگار ٹائپ کا سگریٹ تھا اور میں یہ سگریٹ پہلے بھی پی چکا تھا۔ میں نے اسکا شکریہ ادا کیا۔ اس نے میرا سگریٹ، لائٹر سے جلایا۔ ایک سگریٹ خود سلگایا اور لمبا کش لے کر نتھنوں سے دھواں نکالتے ہوئے بولی:

''آگے کہاں جانے کا ارادہ ہے؟ میں تو قرطبہ جا رہی ہوں۔ ایک آدمی نے مجھے غرناطہ سے یہاں تک لفٹ دے دی تھی''۔

میں نے کہا: ''میرا ارادہ قرطبہ جانے کا ہے مگر میں خانہ بدوشوں کے کسی قافلے کے ساتھ سفر کرنا چاہتا ہوں''۔

وہ اپنی بھوری آنکھیں پوری کھول کر مجھے تکنے لگی:

''واؤ! تم بڑے رومانٹک آدمی معلوم ہوتے ہو۔ کیا واقعی تم خانہ بدوشوں کے ساتھ سفر کرنا چاہتے ہو؟ میں نے سپین کے خانہ بدوشوں کے بارے میں بڑی رومانٹک کہانیاں پڑھ رکھی ہیں۔ اچھا خیال ہے۔ پھر تو میں بھی تمہارے ساتھ سفر کروں گی۔ کیا یہاں کوئی خانہ بدوش قافلہ مل جائے گا؟''

میں سوچنے لگا کہیں میں نے اس عورت کو یہ سب کچھ بتا کر غلطی تو نہیں کی؟ یہ عورت اگر میرے ساتھ کسی خانہ بدوش قافلے کے ہمراہ سفر کرنے لگی تو کہیں راستے میں کوئی پرابلم نہ پیدا ہو جائے۔ مگر میں اس کو اپنے دل کی بات بتا کر غلطی کر بیٹھا تھا۔ میں نے کہا:

''یہاں تو کوئی خانہ بدوش لوگ مجھے دکھائی نہیں دیتے۔ ہو سکتا ہے آگے کسی وادی میں کہیں مل جائیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ مجھے بذریعہ بس ہی قرطبہ جانا چاہیے۔ سپین کے خانہ بدوش لوگ جرائم پیشہ ہوتے ہیں''۔

وہ مردانہ انداز میں میری طرف جھک کر بولی:

''تم فکر نہ کرو۔ میں خود جرائم پیشہ ہوں''۔

اور پھر قہقہہ لگا کر ہنسی:

''میرا مطلب ہے کہ میں شمالی انگلستان کے جس قصبے کی رہنے والی ہوں، وہاں کی عورتیں جب اور جس وقت چاہیں، جرائم پیشہ بن سکتی ہیں''۔

اس نے یہ بات مجھے ایک آنکھ دبا کر کہی تھی۔ واقعی اس عورت میں کئی ایک مردانہ صفات تھیں۔ اس کا قد کاٹھ بھی مردوں جیسا تھا۔ بازو لمبے تھے اور شانے بھی چوڑے تھے۔ پہلے خیال آیا کہ اس انگریز عورت کو میں یہیں چھوڑ کر آگے چلا جاتا ہوں اور کسی دوسرے گاؤں میں پہنچ کر خانہ بدوشوں کی تلاش میں نکلوں گا۔ پھر سوچا کہ سیاحت کے دوران کوئی ساتھی مل

جائے تو کئی ایک پرابلم آسانی سے حل ہو جاتے ہیں اور آدمی کئی ایک چھوٹی چھوٹی پریشانیوں سے بھی بچ جاتا ہے۔ میں نے اس عورت کو ساتھ رکھنے کا دل میں فیصلہ کر لیا اور کہا:

''پھر تو بڑی اچھی بات ہے۔ میرا خیال ہے ایسا وقت نہیں آئے گا۔ کیونکہ ہم خانہ بدوشوں کے ساتھ صرف قرطبہ تک ہی سفر کریں گے''۔

اس انگریز خاتون نے اپنا مردوں ایسا ہاتھ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا: ''میرا نام ایلس ہے''۔

میں نے اس کا مضبوط اور کسی حد تک کھردرا ہاتھ دباتے ہوئے اسے اپنا نام بتایا۔ وہ مسکرائے جا رہی تھی۔

''عام حالات میں اگر ہم ملتے تو شاید ہمیں اتنی خوشی نہ ہوتی۔ اب ہم اکٹھے سفر کا لطف اٹھا سکیں گے۔ ویسے میں انڈیا سے اکیلی ہی آ رہی ہوں۔ راستے میں ایک جرمن اور ایک ہنگری کا ٹورسٹ ملا تھا مگر دونوں بڑے گندے تھے۔ میں نے جرمن کا منہ چوما تو اس کے منہ سے ویل مچھلی کی بو آ رہی تھی۔ کیا تم نے کبھی ویل مچھلی کا شکار کیا ہے؟''

میں نے کہا: ''شکار تو کبھی نہیں کیا لیکن فلموں میں ویل مچھلیوں کا شکار ہوتے ضرور دیکھا ہے''۔

دیہاتی ریستوران کا لڑکا میرا اور ایلس کا دونوں بل لے کر آ گیا۔ میں نے تکلفاً کہہ دیا: ''میں پے کروں گا''۔ ایلس ہنستے ہوئے اپنے بیگ میں سے بٹوہ نکال کر بولی:

''نہیں۔ بل میں پے کروں گی''۔

اس نے بٹوے میں سے پیسٹی کرنسی کا ایک نوٹ نکال کر بل ادا کر دیا۔ اس کے بعد دوسرا سگریٹ سلگایا اور حسب معمول اسکا آدھا دھواں منہ سے اور باقی آدھا نتھنوں سے نکالتے

ہوئے بولی:

''تو پھر اب کیا پروگرام ہے؟ چلو چل کر کسی خانہ بدوش قافلے کا پتہ چلاتے ہیں۔ میرا خیال ہے یہاں کے گاؤں والوں کو ضرور معلوم ہوگا۔ خانہ بدوش تو اس وادی سے گزرتے ہی رہتے ہوں گے''۔

ہم اٹھ کر دیہاتی ریستوران کے بوڑھے مالک کے پاس گئے جو انگیٹھیوں کے کاؤنٹر کے پیچھے کرسی پر بیٹھا آنکھیں اخبار کے بالکل نزدیک لا کر اخبار پڑھ رہا تھا۔ ایلس نے اسپینی زبان سیکھی ہوئی تھی۔ وہ خانہ بدوشوں کے بارے میں بوڑھے سے باتیں کرنے لگی۔ بوڑھا کبھی ایک طرف اشارہ کرتا۔ کبھی ہاتھ دوسری طرف کر کے اشارہ کرتا۔ کبھی کندھے اچکاتا۔ کبھی گردن نفی میں ہلاتا اور کبھی میری طرف دیکھ کر ہنسنے لگتا۔

ایلس نے بوڑھے کا شکریہ ادا کیا اور مجھے لے کر باہر بچھی کرسیوں کے پاس آ گئی۔ ہم کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ میں نے پوچھا:

''بوڑھا کیا کہہ رہا تھا؟''

ایلس نے بھی شانے اچکائے اور بولی:

''اسے کچھ پتہ نہیں ہے۔ کبھی کہتا تھا کہ جپسی اسی پہاڑی کے پیچھے سے گزرتے ہیں، کبھی کہہ رہا تھا کہ اس طرف پرسوں میں نے ایک خانہ بدوش بوڑھے کو جاتے دیکھا تھا۔ پھر کہنے لگا کہ ہوسکتا ہے وہ خانہ بدوش نہ ہو''۔

ایلس کچھ مایوس سی نظر آنے لگی۔ مجھے احساس ہوا کہ اسے واقعی خانہ بدوش قبیلے کے ساتھ سفر کرنے کی زبردست خواہش پیدا ہوگئی تھی۔ میں نے کہا:

''میں نے پروگرام اس طرح بنایا تھا کہ میں یہاں سے پہاڑیوں کے درمیان چلنا

شروع کر دوں گا۔ اتنی معلومات میں نے حاصل کر رکھی ہیں کہ خانہ بدوشوں کے قافلے ان سامنے والی پہاڑیوں کی دوسری طرف وادی میں سے گزرا کرتے ہیں۔ اب یہی ہوسکتا ہے کہ یا تو ابھی اپنے سفر پر روانہ ہو جائیں یا رات اسی گاؤں میں کسی جگہ بسر کر لیں اور صبح کو چل پڑیں"۔

ایلس نے مٹھی بند کر کے لہرائی اور اسے میز پر آہستہ سے مارتے ہوئے کہا:

"ہم ابھی اپنے رومانٹک سفر کا آغاز کریں گے۔ ان پہاڑیوں میں اگر رات آ گئی تو وہیں کسی چشمے کے کنارے کمبل اوڑھ کر سو جائیں گے۔ میں تو اکثر راتیں اسی طرح بسر کرتی آ رہی ہوں۔ کیا تمہارے پاس کمبل ہے؟"

میں نے کہا: "کمبل تو میرے پاس نہیں ہے؟"

وہ بے نیازی سے سر ہلا کر بولی:

"نو پرابلم۔ ہم ایک ہی کمبل میں سو جائیں گے، یہاں رات کو اتنی سردی نہیں ہوتی"۔

اس کی اس بات سے میں ڈر گیا۔ یہ ڈر مجھے صرف اس مردانہ اوصاف والی عورت سے محسوس ہونے لگا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایلس دوبارہ نقشے کا بغور مطالعہ کرنے لگی۔ اس نے نقشے پر ایک جگہ انگلی رکھی اور میری طرف جھک کر کہا:

"یہ دیکھو۔ ہمیں یہاں سے مشرق کی طرف جو پہاڑی سلسلہ نظر آ رہا ہے، اس رف جانا ہوگا"۔

پھر ایلس نے ہاتھ کا اشارہ مشرقی پہاڑی سلسلے کی طرف کیا:

"یہ سامنے جو پہاڑیاں ہیں، ان کے پیچھے "لوجانا" کی وادیوں کا ٹریک شروع ہو جاتا ہے۔ خانہ بدوش عام طور پر شہری آبادی سے ہٹ کر ان وادیوں سے ہی گزرتے ہیں"۔

میں نے ایلس سے کہا کہ ابھی کافی دن باقی ہے۔ ہمیں اسی وقت نکل چنا چاہیے تا کہ شام ہونے سے پہلے پہلے لوجانا کی وادیوں میں پہنچ جائیں۔

''اچھا خیال ہے''۔

ایلس نے نقشہ تہہ کر کے تھیلے میں رکھتے ہوئے کہا۔ ہم دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہم نے اپنے اپنے تھیلے اسی طرح اپنی اپنی پشت پر باندھ لئے جس طرح میں دو شہروں کے درمیان شاہراہوں پر ہچ ہائکنگ کرتے ہوئے باندھ لیا کرتا تھا۔ ہم دیہاتی ہوٹل کے احاطے سے نکلے اور اس سڑک پر چل پڑے جو قرطبہ کی طرف جاتی تھی۔ میں نے دیکھا کہ ایلس نوجوان لڑکیوں کی طرح چل رہی تھی۔ سڑک پکی تھی مگر زیادہ چوڑی نہیں تھی۔ ہماری رفتار تیز نہیں تھی۔ لمبے روٹ پر پیدل سفر کرنے والے سیاح کبھی تیز نہیں چلتے۔ ان کی ایک نپی تلی چال ہوتی ہے۔ ہم بھی اسی چال سے سڑک کے کنارے کنارے چل رہے تھے۔ سورج تقریباً ہمارے سر پر ہی تھا۔ کچھ دور تک سڑک کی چڑھائی تھی۔ پھر نشیب شروع ہو گیا۔ ہم کسی کسی وقت کوئی بات بھی کر لیتے تھے۔ کوئی تین چار کلومیٹر چلنے کے بعد سڑک میں سے ایک چھوٹی کچی سڑک نکل کر بائیں جانب کی پہاڑیوں کی طرف جاتی نظر آئی۔ ایلس اور میں وہیں سڑک کنارے ایک برساتی نالہ کے پل پر بیٹھ گئے۔ ایلس نے نقشہ نکال کر دیکھا۔ کہنے لگی:

''ان پہاڑیوں کو یہ راستہ جاتا ہے''۔

پھر ادھر ادھر دیکھ کر بولی:

''ان لوگوں کو چاہیے تھا کہ یہاں لوجانا قصبے کی تختی ہی لگا دیتے''۔

ہمارے سانس تھوڑے تھوڑے پھول رہے تھے اور پہاڑی علاقے میں زیادہ دیر چلنے سے پسینہ بھی آ رہا تھا۔ ٹھنڈی ہوا بڑی اچھی لگ رہی تھی۔ ایلس ایک فوجی جوان کی طرح اٹھ

کھڑی ہوئی۔ اس نے سفری تھیلا اپنی پشت پر ڈال کر اس کے فیتے کاندھوں پر کسے اور کہا:

''ہمیں سورج غروب ہونے سے پہلے لوجانا وادی میں پہنچنا ہے۔ بہت ریسٹ کر لی۔ آؤ''۔

یہ چھوٹی سی کچی سڑک پہاڑی ٹیلوں کے ساتھ ساتھ بل کھاتی چلی گئی تھی۔ کہیں چڑھائی آ جاتی۔ کہیں اترائی آ جاتی۔ پہاڑیوں کی ڈھلانوں پر درخت بھی تھے اور گھاس بھی۔ یہ واقعی سرسبز پہاڑی علاقہ تھا۔ نیچے ذرا نشیب میں کہیں گیہوں اور جوار کے کھیت شروع ہو جاتے۔ کہیں کھجوروں کا باغ آ جاتا۔ ایلس میرے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ کسی وقت وہ میرے آگے ہو جاتی تھی۔

چلتے چلتے سورج مغربی پہاڑیوں کے پیچھے چھپنے لگا۔ ایلس بولی:

''لگتا ہے یہ پہاڑی سلسلہ کافی طویل ہے''۔

میں نے اردگرد نگاہ ڈالی:

''آس پاس کوئی گاؤں بھی نظر نہیں آ رہا''۔

ایلس نے رک کر سانس لیا اور بولی:

''یہ غیر آباد علاقہ ہے۔ گاؤں آگے وادی میں جا کر ملے گا، چلو''۔

سورج غروب ہو گیا۔ پہاڑیوں کے نشیب پر سائے سے چھا گئے۔ میں سوچ رہا تھا کہ ایلس نے شاید غلط روٹ چن لیا ہے۔ میں نے اپنے اس خدشے کا اظہار کیا تو ایلس بولی:

''میں نقشے کے مطابق چل رہی ہوں۔ یہ نقشہ برطانیہ کی جیوگرافکل سوسائٹی نے شائع کیا ہے، یہ کبھی غلط راہ نمائی نہیں کرے گا''۔

ایلس کا اندازہ بالکل درست نکلا۔ ہم ایک پہاڑی کا چکر کاٹ کر دوسری طرف نکلے تو

ہمارے سامنے نشیب میں ہری بھری وادیوں کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا تھا۔ ایلس نے خوش ہو کر کہا:

''دیکھا تم نے؟ یہ لوجانا کی وادیاں ہیں۔ نقشہ ہماری صحیح راہ نمائی کر رہا تھا۔

ہم وہیں زمین سے نکلی ہوئی ایک چٹان پر بیٹھ گئے۔ اور وادیوں میں نظر آتے کھجوروں اور سرو کے درختوں کے جھنڈوں اور غروب آفتاب کی قرمزی روشنی میں ان کی چمکتی ہوئی چوٹیوں کو دیکھنے لگے۔ کہیں کہیں کھیتوں کے درمیان ایک دو دیہاتی مکان بھی نظر آئے۔ میں نے ایلس سے کہا:

''میرا خیال ہے تھوڑی دیر میں رات ہو جائے گی اور رات کے وقت جپسی ٹریک تلاش کرنے میں مشکل پیش آئے گی''۔

''تم کیا مشورہ دیتے ہو؟'' ایلس نے سگریٹ نکال کر کہا۔

میں اصل میں رات کو ایلس کے ایک ہی کمبل میں سونے سے گھبرا رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ رات کسی گاؤں کے مکان میں بسر کرنے کی کوشش کی جائے۔ کم از کم وہاں مجھے دوسرا کمبل تو ضرور مل جائے گا۔ میں نے کہا:

''میرا خیال ہے، وادی میں اتر کر کسی گاؤں میں چلتے ہیں، رات وہیں گزارتے ہیں۔ ہمیں کسی نہ کسی باڑے میں ہی جگہ مل جائے گی''۔

ایلس کہنے لگی:

''یہ لوگ سیاحوں کو لوٹ لیتے ہیں۔ مجھے لندن سے چلتے وقت بھی میرے دوستوں نے خبردار کیا تھا''۔

''ہمارے پاس ہے ہی کیا جو لوٹیں گے''۔

میں نے اعتراض کیا۔ ایلس بولی:

''میرے پاس برٹش پاؤنڈ ہیں اور تمہارے پاس بھی تھوڑی بہت نقدی ضرور ہوگی۔ ذرا سوچو اگر یہ سب کچھ ہم سے چھن گیا تو ہم کہاں جائیں گے۔ اور پھر یہ لوگ سیاحوں کے پاسپورٹ چرا کر انہیں جرائم پیشہ لوگوں کے ہاتھ فروخت کر دیتے ہیں جو ان پر دوسروں کی تصویریں لگا کر اور جعلی مہریں لگا کر آگے بھاری معاوضے پر بیچ دیتے ہیں۔ ہمیں تو ان دیہاتی لوگوں سے دور دور ہی رہنا ہوگا''۔

میرے پاس اب مزید اعتراض کی گنجائش نہیں تھی کیونکہ سپین کے دیہاتی لوگوں کے بارے میں میں نے بھی اس قسم کی باتیں سن رکھی تھیں۔ سبھی دیہاتی ایسے نہیں ہوتے مگر کسی اچھے دیہاتی کو تلاش کرنا ہمارے بس کی بات نہیں تھی۔ مجھے بھی ڈر تھا کہ اگر میرا پاسپورٹ چرا لیا گیا تو میں تو بے یار و مددگار رہ جاؤں گا اور ہو سکتا ہے میں پکڑا جاؤں اور بغیر پاسپورٹ ویزے کے سپین میں داخل ہونے کے جرم میں جیل پہنچا دیا جاؤں۔

میں نے ایلس کے کمبل کو ذہنی طور پر قبول کر لیا۔ اب میں یہ سوچ رہا تھا کہ جتنی جلدی ہو سکے یعنی رات کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے پہلے وادی میں اتر کر کسی خانہ بدوش قبیلے کو تلاش کر لیا جائے۔ میں نے ایلس سے کہا:

''اب ہمیں چلنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے وادی کے کسی علاقے میں ہمیں سپینی جپسی ڈیرہ ڈالے ہوئے مل جائیں''۔

''یہ تم نے ٹھیک کہا۔ چلو، چلتے ہیں''۔

ہم چٹان پر سے اٹھے اور ایک پہاڑی پگ ڈنڈی پر چلتے ہوئے نیچے وادی میں اترنے لگے۔

وادی کے کھیتوں اور درختوں تک پہنچتے پہنچتے شام کا اندھیرا چاروں طرف پھیل چکا تھا۔ کھیتوں کے بیچ میں سے کچا راستہ وادی کے مشرق کی طرف جاتا تھا۔ ہم اس راستے پر چلنے لگے۔ ایلس کو یقین تھا کہ کافی رات ہونے سے پہلے پہلے ہمیں کوئی نہ کوئی جپسی قبیلہ کسی باغ میں خیمہ زن ضرور مل جائے گا۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ ہم کھجوروں کے ایک بہت بڑے باغ میں سے گزرے۔ اب ہمیں بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی۔ ایک ندی کے چھوٹے سے پل پر سے گزرے۔ ایلس نے ندی کے پانی کو دیکھ کر کہا:

''میں پانی پیوں گی، میری پانی کی بوتل بھی خالی ہو چکی ہے''۔

ہم نے وہاں ندی کی پلیا پر اپنے اپنے تھیلے اتار کر رکھ دیئے۔ ایلس پلاسٹک کی بوتل لے کر ندی پر گئی۔ اس نے ہاتھوں سے ندی کی لہروں کو ادھر ادھر ہٹا کر پانی پیا۔ پھر بوتل میں پانی بھرا اور اس کے ڈھکن کو کستے ہوئے بولی:

''یہ چشمے کا پانی ہے، بڑا میٹھا ہے، تم بھی تازہ دم ہو جاؤ گے''۔

چشمے کا پانی ٹھنڈا اور میٹھا تھا۔ میں نے منہ ہاتھ دھو کر پانی پیا اور اللہ کا شکر ادا کیا۔ واقعی میں تازہ دم ہو گیا۔ ایلس نے تھرمس کھول کر کافی نکال کر ایک پیالی مجھے دی، ایک پیالی خود پی۔ کہنے لگی:

''میں نے یورپ کی بڑی سیاحت کی ہے۔ میں سارا ضروری سامان اپنے ساتھ رکھتی ہوں۔ میرے پاس ڈی ٹول اور زخم پر باندھنے والی پٹی بھی ہے۔ برانڈی کا پائنٹ بھی ہے۔ سوئی دھاگہ اور چاقو بھی ہے''۔

ایلس نے سب کچھ رکھا ہوا تھا مگر کمبل ایک ہی تھا۔ مجھے اسی کمبل سے ڈر لگ رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ میں نے کمبل کو چھوڑ بھی دیا تو کمبل مجھے نہیں چھوڑے گا۔ وہاں گھاس پر کھجوریں

درختوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر گری ہوئی تھیں۔ ہم نے تھوڑی سی کھجوریں بھی کھائیں۔ ایک ایک سگریٹ پیا اور پھر آگے چل پڑے۔

جیسے جیسے ہم آگے جا رہے تھے، رات کا اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ اندھیرے میں ہم انجیروں کے باغ میں سے گزرے۔ آسمان پار تارے چمکنے لگے تھے۔ ایلس نے اندھیرے میں ہی ایک درخت سے انجیر توڑ کر کھائی۔

''بڑی میٹھی انجیریں ہیں۔ لو تم بھی کھا کر دیکھو۔

انجیر واقعی میٹھی تھی۔ ایلس درخت پر انجیریں توڑ توڑ کر کھا رہی تھی۔ کہنے لگی:۔

''یہ لوگ انجیروں کا مربہ بڑا مزیدار بناتے ہیں''۔

میں نے ایلس سے کہا:

''یہاں انگوروں کا باغ کہیں نظر نہیں آیا''۔

ایلس بولی: ''انگوروں کے باغ گاؤں کے مکانوں کے قریب قریب لگائے جاتے ہیں۔ دیہاتی لوگ تو اکثر انگور کے باغ اپنے مکانوں کے عقبی صحن میں لگاتے ہیں۔ اسے وائن یارڈ کہتے ہیں۔ یہ لوگ انگور کی وائن خود بناتے ہیں''۔

انجیروں کے درخت کے پاس اندھیرے میں کھڑی ان کا پھل کھاتی ایلس مجھے کوئی بھوت لگ رہی تھی۔ رات کسی گاؤں کے دیہاتی مکان یا باڑے میں بسر کرنے کا خیال اب خواب ہو گیا تھا۔ وہاں آس پاس کہیں کسی گاؤں کی معمولی سی روشنی بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ خانہ بدوشوں کے قافلے کو رات کے وقت ہم تلاش نہیں کر سکتے تھے۔ ہم چلتے چلتے انجیروں کے باغ سے نکل کر ایک جگہ اونچے اور گھنے درختوں کے جھنڈ کے پاس پہنچے، یہاں وہی ندی دوسری طرف سے بل کھا کر بہتی ہوئی آگے کھیتوں کی طرف نکل گئی تھی۔ اندھیرا بڑھ گیا

تھا۔ ہمیں ایک دوسرے کی شکلیں دھندلی نظر آنے لگی تھیں۔ ایلس نے ایک درخت کے نیچے سفری تھیلا اتار کر رکھ دیا۔

''بس یہیں رات بسر کریں گے۔ خانہ بدوشوں کی تلاش صبح شروع کریں گے''۔

مجھے بھوک محسوس ہونے لگی تھی۔ میں نے ایلس سے کہا:

''آگے چلتے ہیں۔ شاید گاؤں ہو۔ وہاں ہمیں کھانے کو بھی کچھ نہ کچھ مل جائے گا''۔

ایلس بولی:

''میرے پاس سوکھا گوشت اور ڈبل روٹی موجود ہے۔ جو تین چار آدمیوں کے لئے کافی ہے۔ ہم یہاں آگ جلائیں گے، سوکھے گوشت کو گرم کریں گے اور مزے سے کھائیں گے۔ اس طرح سفر کرنے میں یہی تو رومانس ہے۔ اگر شہر کے ہوٹلوں اور دیہات کے مکانوں میں بیٹھ کر ہی کھانا کھانا ہے تو پھر تمہیں پاکستان سے اور مجھے برطانیہ سے نکلنے کی کیا ضرورت تھی''۔

بات ایلس نے بالکل سچی کی تھی۔ سیاحت کا مزا بھی یہی ہے کہ رات کو جنگل میں الاؤ جلا کر بیٹھا جائے۔ جنگلی شکار بھونا جائے۔ چائے کافی بنا کر وہیں پی جائے۔ سیاحت کا رومان اسی میں ہے۔

میں نے بھی تھیلا اترا کر رکھ دیا تھا۔ ہم نے ادھر ادھر سے سوکھی لکڑیاں جمع کر کے پتھروں کے درمیان آگ جلائی۔ ایلس کا تھیلا عمرو عیار کی زنبیل تھا۔ اس نے تھیلے میں سے چھوٹا سا فرائی پین نکال کر اس میں سوکھے گوشت کے قتلے ڈالے اور آگ پر رکھ کر انہیں گرم کرنے لگی۔ میں ایک خدشے کا اظہار کرنا چاہتا تھا مگر ایلس نے اس کی خود ہی وضاحت کر دی۔:

''تم مسلمان ہو۔ میں جانتی ہوں کہ تم سور نہیں کھاتے، میں بھی نہیں کھاتی۔ اصل میں

میری ماں یہودن تھی، وہ سور نہیں کھاتی تھی۔ گوشت بھی ہمارے ایسے جانور کا آتا تھا جس کو چاقو چھری سے ذبح کیا گیا ہو اور اس کا سارا خون جسم سے نکال دیا گیا ہو۔ یہ مٹن ہے اور چاقو سے ذبح کئے ہوئے مینڈھے کا ہے"۔

پتھروں کے درمیان جلتی آگ کے چھوٹے چھوٹے شعلے کناروں سے اوپر کو لہراتے ہوئے بڑے خوب صورت لگ رہے تھے۔ ہم نے ڈبل روٹی کے ساتھ گوشت کے گرم قتلے کھائے۔ اس کے بعد تھرماس میں سے کافی نکال کر پی اور سگریٹ سلگا کر درخت سے ٹیک لگا کر کافی نکال کر پی اور سگریٹ پیتے ہوئے باتیں کرنے لگے۔ ایلس نے ایک ذمے دار سیاح کی طرح پتھروں کے درمیان جلتی آگ کو اچھی طرح بجھا دیا تھا۔ رات گہری ہوتی جا رہی تھی۔ چونکہ ہم درختوں کے نیچے بیٹھے تھے، اس لئے ہم پر شبنم نہیں گر رہی تھی اور وہاں زیادہ خنکی بھی نہیں تھی مگر فضا میں ٹھنڈک موجود تھی۔ اندھیرے میں درخت خاموش ہیولوں کی طرح کھڑے تھے۔ لگتا تھا کہ یہ درخت نہیں ہیں بلکہ درختوں کے سائے ہیں۔ پہاڑی چشمے میں پانی کسی پتھر سے ٹکرا کر گزر رہا تھا۔ اس کی مترنم آواز ایک میوزک کی طرح مسلسل آ رہی تھی۔ اس کے سوا ہر طرف گہری خاموشی تھی۔ ایلس نے سگریٹ بجھا دیا اور اپنے عمرو عیار کے تھیلے میں سے وہ خطرناک کمبل نکالا جس سے میں صبح سے خوف زدہ تھا۔ میں نے کہا:

"تم کافی سیر و سیاحت کرتی ہو۔ تمہیں اپنے ساتھ کم از کم ایک سلیپنگ بیگ ضرور رکھنا چاہیے تھا"۔

اگر اس کے پاس سلیپنگ بیگ ہوتا تو میں کمبل اوڑھ کر الگ سو سکتا تھا۔ ایلس کمبل کو کھول رہی تھی۔ معلوم ہوا کہ یہ کافی لمبا چوڑا کمبل تھا۔ اس نے کہا۔

"سلیپنگ سگ یورپ کے سرد علاقوں کی سیاحت کے وقت تو کام آ جاتا ہے مگر یہاں

بہار کا موسم ہے۔ تم سلیپنگ بیگ میں نہیں سو سکتے۔ یہ کمبل کافی بڑا ہے۔ میں آدھا زمین بچھا لیتی ہوں، آدھا اوپر اوڑھ کر سو جاتی ہوں۔

تم بھی میرے ساتھ ہی ایک طرف لیٹ جانا"۔

اس نے میری طرف دیکھا۔ اندھیرے میں مجھے اس کی بھورے رنگ کی آنکھیں کسی ایسی بلی کی طرح چمکتی دکھائی دیں جس نے اندھیرے میں اپنے شکار کو دیکھ لیا ہو۔ میں نے کہا:

"مجھے سردی نہیں لگتی۔ کمبل کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ میں وہاں گھاس پر سو جاؤں گا"۔

ایلس بولی:

"تم مشرقی لوگ بڑے شرمیلے ہوتے ہو، میرے ساتھ سونے میں کیا فرق پڑے گا۔ کیا تمہارے دل میں کوئی برا خیال ہے؟ میرے دل میں تو نہیں ہے۔ میں تو کئی سیاحوں کے ساتھ اسی ایک کمبل میں رات گزار چکی ہوں۔ کوئی فرق نہیں پڑتا"۔

اس نے اپنے جوگر بوٹ اتار کر ایک طرف رکھ دیئے اور ایک طرف سرہانے کے طور پر اپنا تھیلا رکھا۔ اس کے ساتھ ہی میرا تھیلا بھی رکھ دیا۔ پھر کمبل میں گھس گئی۔

"آ جاؤ۔ تم بھی آ جاؤ۔ گھاس پر سوؤ گے تو سردی میں ٹھٹھر جاؤ گے۔ گھاس میں کیڑے مکوڑے بہت ہوتے ہیں"۔

میں نے کہا: کیڑے مکوڑے تو کمبل میں بھی آ جائیں گے"۔

ایلس نے کہا: "مسٹر! یہ کمبل خاص نائیلون کا بنا ہوا ہے۔ اس میں ایک ایسا کیمیکل استعمال ہوا ہے جو کیڑے مکوڑوں اور تمام رینگنے والے کیڑوں کو اس سے دور رکھتا ہے۔ یہ کمبل خاص طور پر ٹورسٹوں کے لئے تیار کئے جاتے ہیں۔ آ جاؤ"۔

میں نے بھی اپنے جوگر شوا تار دیئے تھے۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ چپکے سے کمبل میں گھس گیا اور ایسا اہتمام کر کے لیٹا کہ میرا جسم ایلس کے جسم سے تھوڑے فاصلے پر رہے۔ ایلس نے سر اپنے تھیلے پر رکھا تھا دونوں بازو باہر نکالے ہوئے تھے۔ اس کے ایک ہاتھ میں ایک سگریٹ تھا۔ وہ اس کے کش لے رہی تھی۔ میری طرف منہ کر کے مجھ سے پوچھا:

''برانڈی پیو گے؟''

میں کوئی ایسا پاک باز بھی نہیں تھا۔ سب کچھ پی لیتا تھا۔ مگر اس وقت میں حفظ ماتقدم کے طور پر برانڈی نہیں پینا چاہتا تھا۔ میں نے کہا:

شکریہ ایلس! برانڈی مجھے پسند نہیں ہے''۔

اس کے بعد ایلس اپنی ماں کی باتیں سنانے لگی۔ اسے اپنی ماں سے بڑی محبت تھی۔ پھر وہ ایک لوری گنگنانے لگی:

''یہ لوری میری ماں مجھے بچپن میں سنایا کرتی تھی۔ یہ لوری سن کر مجھے نیند آ جاتی تھی''۔

اس نے سگریٹ کا کش لگا کر ذرا اٹھ کر سگریٹ کو گھاس پر زور زور سے رگڑ کر بجھایا۔ کمبل میں گھسی اور دوسری طرف پہلو بدلتے ہوئے بولی:

''اب میں سونا چاہتی ہوں۔ تم بھی سو جاؤ''۔

میں بالکل سیدھا کمبل کے اندر لیٹا اوپر درخت کی سیاہ شاخوں کو دیکھ رہا تھا۔ فضا میں ایلس کے سگریٹ کی بو ابھی تک باقی تھی۔ چشمے والی ندی کی طرف سے پانی کے پتھر سے ٹکرانے کی مترنم آواز آ رہی تھی۔ میرا ایک پہلو ذرا سا ایلس کے جسم کو چھو رہا تھا۔ میں نے اپنے جسم کو سکیڑ لیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد مجھے ایلس کے خراٹوں کی آواز آنے لگی۔ وہ گہری نیند سو گئی تھی۔ میں بڑا حیران ہوا۔ یہ کیسی عورت ہے کہ ایک مرد کے ساتھ بے فکر ہو کر سو گئی ہے اور خراٹے لے رہی

ہے۔ جبکہ میں جاگ رہا تھا اور اس خیال سے میرے ذہن میں ایک ہیجان سا بپا تھا کہ میں رات کو جنگل کے اندھیرے میں ایک عورت کے ساتھ لیٹا ہوا ہوں۔ پھر میرے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔ دراصل یہ میرے ذہن کا احساس جرم تھا جو مجھے پریشان کر رہا تھا۔ یہ احساس ایلس کے ذہن میں نہیں تھا۔ یہ میرے ذہن کے وہ گندے خیال تھے جو مجھے ہیجان میں مبتلا کئے ہوئے تھے۔ اس قسم کے خیالات سے ایلس کا ذہن پاک تھا۔ چنانچہ وہ صاف ذہن اور صاف ضمیر کے ساتھ بڑی جلدی اور بڑے مزے سے سو گئی تھی۔ یقین کریں اس وقت مجھے ایلس ایک معصوم پھول کی طرح معلوم ہوئی اور اپنے آپ پر مجھے شیطان کے چیلے کا گمان ہوا۔ پھر میں نے لاحول ولاقوہ۔۔۔ پڑھی اور دوسری طرف پہلو بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے اپنے ذہن کو ہر قسم کے واہیات خیالات سے پاک کر لیا تھا اور خدا کے حضور دعا مانگ رہا تھا کہ اے خدا! تو میرے ذہن کو اسی طرح پاک صاف رکھنا۔

جس وقت میری آنکھ کھلی تو درختوں کی شاخوں میں سے دھوپ چھن چھن کر میرے اوپر پڑ رہی تھی اور کمبل میں مجھے گرمی لگ رہی تھی۔ میں نے کمبل جسم پر سے ایک طرف ہٹایا۔ اپنے پہلو میں دیکھا۔ ایلس وہاں نہیں تھی۔ ہر طرف دن کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ درختوں پر سے پرندوں کے چہچہانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ مجھے اتنا اچھا لگا کہ بے اختیار خدا کے حضور سجدہ کرنے کو جی چاہا۔ یہ اثر تھا رات بھر کے نیک خیالات اور پاکیزہ سوچ کا۔ اگر رات کو میں نے کوئی گناہ کیا ہوتا تو میرا ضمیر بوجھل ہوتا۔ میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا ہوتا اور دن کی روشنی مجھے رات کے اندھیرے سے زیادہ بری لگتی۔ مگر معاملہ اس کے برعکس تھا۔ میرا ضمیر مطمئن تھا۔ خیالات ہلکے پھلکے اور خدائے بزرگ و برتر کی حمد و ثنا کے جذبات سے لبریز تھے۔ گھاس اور پھولوں کی ہلکی ہلکی خوشبو محسوس ہو رہی تھی۔ ندی کے پانی کا ترنم کسی سرمدی نغمے کی طرح روح کو

سکون بخش رہا تھا۔ سچ ہے، مطمئن ضمیر اور پاکیزہ خیالات میں ہی انسان کی عافیت ہے۔ یہی اس کائنات کی حقیقت ہے، باقی سب وسوسے، پریشانیاں اور بیماریاں ہی بیماریاں ہیں۔ اللہ تعالےٰ مجھے اپنی پناہ میں رکھے۔ میرے دل سے بے اختیار یہ دعا نکل گئی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ندی کے کنارے ایک جانب کوئی باغ تھا۔ رات کو یہ باغ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے ایلس کو دیکھا۔ وہ باغ میں سے نکل کر میری طرف آ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں کسی درخت کی بڑی ٹہنی تھی جس پر سرخ رنگ کی نارنگیاں لگی ہوئی تھیں۔ میرے پاس آ کر بولی:

''اس باغ کی نارنگیاں بڑی میٹھی ہیں۔ لو تم بھی کھاؤ''۔

میں نے کہا: ''پہلے میں منہ ہاتھ دھو آؤں''۔

''جاؤ۔ تم منہ ہاتھ دھو آؤ۔ اتنے میں میں آگ جلا کر تازہ کافی بناتی ہوں''۔

میں ندی کی طرف نکل گیا۔ جب منہ ہاتھ دھو کر واپس آیا تو ایلس نے آگ جلا رکھی تھی۔ وہ فرائی پین میں گوشت کے قتلے تل رہی تھی۔ میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔

''مجھے تو رات ذرا بھی ہوش نہیں رہا۔ بہت تھکی ہوئی تھی۔ گہری نیند سوئی۔ تم سناؤ۔ تمہیں نیند آ گئی تھی؟''

میں نے سگریٹ جلاتے ہوئے کہا:

''ہاں، میں بھی گہری نیند سویا''۔

ہم نے بڑے مزے سے ناشتہ کیا۔ ایلس نے کافی بڑی مزے دار بنائی تھی۔ وہ زیادہ کڑوی نہیں تھی۔ اس کے پاس ہالینڈ کے خشک دودھ کا ڈبہ تھا جس میں کریم ملی ہوئی تھی۔ میں کافی کے دو پیالے پی گیا۔ ہم نارنگیاں کھانے لگے، نارنگیاں بڑی شیریں تھیں۔

ایلس نے کمبل تہہ کر کے تھیلے میں ڈال دیا۔ پھر باقی کا سامان بھی صاف کر کے تھیلے

میں سنبھال کر رکھا۔ اور درخت کے ساتھ ٹیک لگاتے ہوئے بولی:

''میرا خیال ہے آج ہمیں آگے خانہ بدوشوں کا کوئی نہ کوئی قافلہ ضرور مل جائے گا۔ خانہ بدوشوں کے سفر کرنے کے لئے تو یہ آئیڈیل علاقہ ہے''۔

تھوڑی دیر کے بعد ہم نے اپنے اپنے تھیلے پیچھے باندھ رکھے تھے اور ندی کے ساتھ ساتھ وادی کے شمال مشرق کی طرف چلے جا رہے تھے۔ ہر طرف دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ ہم انگوروں کے ایک باغ کے قریب سے گزرے۔ وہاں دو عورتیں اور ایک مرد چھکڑے میں انگوروں کے کریٹ لاد رہے تھے۔ ایک بچی کی چھوٹی سی منڈیر پر بیٹھی سیاہ انگوروں کا گچھا لئے مزے مزے سے انگور کھا رہی تھی۔ ہم ان کے قریب سے گزرے تو ایلس نے رک کر انہیں سپینی سلام کیا اور کچھ کہا۔

ایک مرد نے جو بوڑھا سا تھا، ایک طرف اشارہ کر کے سپینی زبان میں کچھ کہا۔ عورت نے انگوروں کے دو بڑے گچھے کریٹ میں سے اٹھا کر ایلس کو مسکراتے ہوئے پیش کئے۔ ایلس نے شکریہ ادا کیا اور میرے قریب آ کر بولی:

''یہ بڑے مہمان نواز لوگ ہیں۔ بوڑھے نے بتایا ہے کہ اس نے کل خانہ بدوشوں کا ایک قافلہ ادھر سے گزرتا دیکھا تھا''۔

بوڑھے ہسپانوی نے ہمیں خوش خبری سنا دی تھی۔ اس نے جس طرف اشارہ کیا تھا، ادھر چھوٹے چھوٹے دو ٹیلے بالکل ایک دوسرے کے ساتھ لگے کھڑے تھے۔ ہم نے ان ٹیلوں کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ یہ ٹیلے دیکھنے میں بڑے قریب لگ رہے تھے مگر جب ہم چلے تو پتہ چلا کہ کافی فاصلے پر واقع تھے۔ درمیان میں ایک پہاڑی ندی آئی ایلس نے اوپر کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ وہی ندی ہے جس کے کنارے ہم نے رات بسر کی تھی''۔

یہاں ندی کا پاٹ چوڑا ہو گیا تھا اور پانی سنگریزوں کے اوپر چھوٹے بڑے پتھروں سے ٹکرا کر بہہ رہا تھا۔ ہم نے جوتوں سمیت ندی عبور کی۔ ہماری جوتوں میں پانی آ گیا۔ مگر سفر میں ایسا کئی بار ہوا تھا کہ جوتے جرابوں سمیت گیلے ہوئے اور پھر چلتے رہنے سے اپنے آپ سوکھ گئے۔ آخر ہم ٹیلوں کے پاس پہنچ گئے۔ ٹیلوں پر لمبی لمبی بھورے رنگ کی گھاس اگی ہوئی تھی۔ ان دونوں ٹیلوں کے درمیان سے ایک تنگ راستہ دوسری وادی میں جا نکلتا تھا۔ یہ تنگ راستہ جنگلی پودوں سے بھرا ہوا تھا۔ میں آگے آگے چل رہا تھا۔ ایلس میرے پیچھے چل رہی تھی۔ اچانک ایلس کی چیخ نکل گئی۔ میں نے گھبرا کر پیچھے دیکھا۔ ایلس ایک پتھر کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ میں نے پتھر کی طرف دیکھا تو وہاں ایک چھوٹی بلی جتنی چھپکلی دھوپ میں بیٹھی لال لال گول آنکھوں سے ہماری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی سرخ زبان بار بار باہر نکل رہی تھی۔

میں نے جھک کر ایک پتھر اٹھایا اور زور سے چھپکلی پر پھینکا۔ پتھر اسے نہ لگا مگر وہ تیزی سے جھاڑیوں میں چھپ گئی۔ ایلس میرے ساتھ لگ گئی۔ وہ بڑی ڈری ہوئی تھی۔ میں نے حیرانی سے کہا:

''تم اتنی بہادر عورت ہو کر ایک چھپکلی سے ڈر گئی ہو''۔

ایلس نے اپنے حواس درست کرتے ہوئے کہا:

''مجھے چھپکلی سے بڑا ڈر لگتا ہے۔ ایک بار برازیل کے جنگلوں میں سفر کرتے ہوئے اس سے بھی بڑی چھپکلی نے میرا راستہ روک لیا تھا۔ مجھے تین دن تک بخار چڑھا رہا تھا''۔

وہ میرے ساتھ لگ کر چل رہی تھی۔ میں نے کہا:

''تم نے ہندوستان میں سفر نہیں کیا؟ وہاں تو بڑے بڑے زہریلے سانپ بچھو ہوتے

ہیں؟''

ایلس کہنے لگی: ''میں صرف ایک بار ہندوستان گئی ہوں، میں نے بنارس شہر کی بڑی تعریف سن رکھی تھی۔ یہ شہر اور اس کے ساتھ بہنے والا دریا اتنا گندا تھا کہ میں نے دو دن بڑی مشکل سے وہاں کاٹے اور بمبئی چلی گئی''۔

میں نے کہا:

''اس دریا کا نام گنگا ہے۔ ہندو لوگ اسے بڑا مقدس دریا سمجھتے ہیں''۔

ایلس بولی:

''اس سے زیادہ غلیظ دریا میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ وہاں ہندو لوگ اپنے مردے جلاتے ہیں۔ مردے جلانے والے مردوں کی ادھ جلی لاش دریا میں پھینک دیتے ہیں۔ مائی گاڑ!''

میں نے طنزاً کہا:

''تم انگریز تو ہندوستان کی تعریف کرتے نہیں تھکتے''۔

ایلس نے سر جھٹک کر کہا:

''وہ اس لئے کہ انگریز قوم کو ہندوؤں ایسے وفادار غلام اپنی کسی نو آبادی میں نہیں ملے۔ تم مسلمانوں پر تو بڑے تھوڑے عرصے تک ترکوں، افغانوں اور مغلوں نے حکومت کی ہے اور پھر وہ بھی تمہارے مسلمان بھائی تھے۔ مگر ہندو تو محمود غزنوی سے بھی پہلے سے غلام در غلام چلے آ رہے تھے''۔

ہم باتیں کرتے چلے جا رہے تھے۔ پہاڑیوں کے درمیان جو تنگ راستہ تھا وہ بڑا دشوار گزار اور پیچ دار تھا۔ ہمیں جھاڑیوں کو ہٹا ہٹا کر راستہ بنانا پڑتا تھا۔ آخر ہم دوسری جانب ایک

خوب صورت وادی میں پہنچ گئے۔ یہ وادی کسی تصویر کی طرح تھی۔ جگہ جگہ گندم، کماد اور جوار کے سبز اور سنہری کھیت تھے۔ ان کھیتوں کے کنارے کنارے سرو اور کھجور کے درخت سنہری دھوپ میں سر اٹھائے کھڑے تھے۔ ایک جانب ٹیلے کے اوپر چھوٹے سے گرجا گھر کا مخروطی مینار نظر آ رہا تھا۔ دائیں جانب ایک کچا راستہ پھل دار باغوں کی طرف جاتا تھا۔ دور سے پھل دار باغوں کے چھوٹے بڑے درخت نظر آ رہے تھے۔ میں نے ایلس سے کہا:

''یہاں تو کوئی خانہ بدوش جپسی نہیں ہیں''۔

ایلس کہنے لگی:

''میرا خیال ہے ان باغوں کے پیچھے چل کر دیکھنا چاہیے'' ''آؤ ادھر کو چلیں''۔

ہم کچے راستے پر کھیتوں میں سے ہوتے ہوئے باغوں کی طرف چل پڑے۔ کھیتوں میں کچھ ہسپانوی کسان کام کرتے نظر آ رہے تھے۔ یہ باغ نارنگیوں کے تھے۔ ہر باغ کے درمیان میں ایک کچا راستہ بنا ہوا تھا جس کی ایک جانب نالی میں دریا یا چشمے کا پانی بہہ رہا تھا۔ جیسے ہی ہم ان باغوں کی دوسری طرف آئے۔ ایلس نے خوش ہو کر میرا بازو پکڑ لیا اور نعرہ مارا:

''وہ دیکھو، جپسی!''

تھوڑے فاصلے پر خانہ بدوشوں نے ڈیرا ڈال رکھا تھا۔ وہاں تین چار خیمے لگے تھے۔ ایک پرانی بگھی نما بند گاڑی کھڑی تھی۔ ایک آدمی گھوڑے کی مالش کر رہا تھا۔ ایک طرف آگ جل رہی تھی جس میں سے دھواں اٹھ رہا تھا اور دو تین عورتیں وہاں بیٹھی تھیں۔ ایلس نے مجھے اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا:

''سنو! اگر ہمیں ان جپسیوں کے ساتھ کچھ دن گزارے ہیں تو ہمیں کسی حکمت عملی سے کام لینا پڑے گا۔ اگر ہم نے انہیں یہ کہا کہ ہم محض شوق کی خاطر ان کے پاس رہنا چاہتے ہیں یا

کچھ دور تک سفر کرنا چاہتے ہیں تو وہ ہمیں شاید اسکی اجازت نہ دیں کیونکہ یہ مشتبہ قسم کے لوگ ہوتے ہیں اور ان کو معلوم ہے کہ پولیس کے آدمی ان کے پیچھے لگے ہوتے ہیں''۔

میں نے پوچھا:

''تو پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟''

ایلس کہنے لگی:

''میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی ہے، ہم انہیں کہیں گے کہ ہم دونوں میاں بیوی ہیں اور سپین کے جپسیوں کے بارے میں ایک کتاب لکھ رہے ہیں کیونکہ ہم سپین کے جپسیوں کو بہت اچھا، فطرت کی آغوش میں رہنے والے، نیچر پرست خوش اطوار لوگ سمجھتے ہیں۔ پس اس مقصد کی خاطر اتنی دور سے چل کر آئے ہیں اور اب ہم آپ لوگوں کے ساتھ کچھ وقت گزارنا چاہتے ہیں۔ یوں وہ ہمیں اپنے ساتھ رکھنے پر راضی ہو جائیں گے اور ہمارا رومانوی شوق پورا ہو جائے گا''۔

میں نے اس تجویز پر اعتراض کرتے ہوئے کہا:

''اور اگر انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ ہم بھی پولیس کے جاسوس ہیں تو پھر؟''

ایلس نے میرا بازو دباتے ہوئے مسکرا کر کہا:

''اسکی تم فکر نہ کرو۔ میں سپینی زبان بڑی روانی سے بول لیتی ہوں۔ میں اس طرح محبت پیار سے بات کروں گی اور ان کی مہمان نوازی کی ایسی لچھے دار تعریف کروں گی کہ وہ کبھی انکار نہیں کریں گے''۔

میں نے کہا: ''ٹھیک ہے، چلو۔ چل کر ان سے بات کرو''۔

ہم کھیتوں میں سے گزرتے خانہ بدوشوں کے ڈیرے پر پہنچے تو آگ کے پاس بیٹھی

ہوئی عورتوں نے ہماری طرف گھور کر دیکھا۔ آگ پر ایک کالا سیاہ بڑا برتن رکھا ہوا تھا جس میں پاس بیٹھی ہوئی عورت لکڑی کی ڈوئی چلا رہی تھی۔ دو تیکھی آنکھوں والی دبلی پتلی لڑکیاں پاس بیٹھی سبزی ترکاری بنا رہی تھیں۔ وہ بھی ہماری طرف تکنے لگیں۔ ایلس نے جاتے ہی سپینی زبان میں اس سے باتیں شروع کر دیں۔ میں نے دیکھا کہ موٹی عورت جو پہلے مشتبہ نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہی تھی، آہستہ آہست اس کے چہرے کے تاثرات بدلنا شروع ہو گئے تھے۔ پھر اس نے مسکرا کر ایلس سے کچھ کہا۔ ایلس نے بھی آگے سے مسکرا کر کچھ کہا۔ جس پر موٹی عورت نے آواز دی۔

''ریکارڈو۔۔تورو۔۔تورو''۔

پاس ہی ایک بند گاڑی کھڑی تھی جس پر بڑے نقش نگار بنے ہوئے تھے۔ سپین کے خانہ بدوشوں کے پاس اس قسم کی گاڑی ضرور ہوتی ہے جس میں عورتیں بیٹھ کر سفر کرتی ہیں۔ اس بند گاڑی کے آگے خچر جتا ہوا ہوتا ہے اور ایک خانہ بدوش اگلی جانب گدی پر بیٹھ کر اسے چلاتا ہے۔ موٹی عورت نے دوسری بار چیخ کر آواز دی:

''ریکارڈو''۔

لکڑی کی بند گاڑی کا دروازہ کھول کر ایک آدمی سپینی زبان میں شاید موٹی عورت کو گالیاں دیتا سر جھاڑتا باہر نکلا۔ اسے دیکھ کر میں اپنی جگہ پر ساکت ہو گیا۔ میں نے اسے پہچان لیا تھا۔ یہ وہی گھنگھریالے سیاہ بالوں اور تلوار مار کہ مونچھوں والا بھاری بھرکم آدمی تھا جس نے لوسینا کے ہوٹل کے کمرہ نمبر ۲۱ میں خوش پوش شکل اونتونیو کو قتل کیا تھا۔ اس نے آنکھیں سکیڑ کر مجھے اور ایلس کو دیکھا اور انگریزی میں پوچھا:

''تم ٹورسٹ ہو؟''

ایلس نے سپینی میں کچھ کہا۔ اس پر موٹی عورت تیز تیز لہجے میں اس قاتل خانہ بدوش کو کچھ سمجھانے لگی۔ اسکا نام ریکارڈو تھا۔ وہ ہمارے قریب آ گیا اور ایلس کو گھور کر دیکھا۔ پھر مسکرایا اور شاید میرے بارے میں کچھ پوچھا۔ ایلس نے اس کے ساتھ میرا تعارف کراتے ہوئے انگریزی میں کہا:

''یہ مسٹر جوزف ہے۔ انڈیا کا رہنے والا ہے، ہم دونوں نے بنگلور میں شادی کر لی تھی۔ اب ہم دونوں سپین کے خانہ بدوشوں پر کتاب لکھنے کے لئے اس ملک میں دو روز پہلے پہنچے ہیں''۔

ریکارڈو نے مسکراتے ہوئے مجھ سے اپنا کھردرا مضبوط ہاتھ ملایا۔ میں نے بھی گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور انگریزی میں اسکا شکریہ ادا کیا۔ اس وقت میں سوچ رہا تھا کہ اگر اسے معلوم ہو جائے کہ اس نے ایک رات پہلے جو خون کیا ہے، میں اسکا عینی گواہ ہوں اور میری گواہی پر اسے پھانسی مل سکتی ہے تو وہ مجھے کبھی زندہ نہ چھوڑے۔ مگر وہ مجھ سے ہاتھ ملا کر مسکرا رہا تھا۔ پھر اس نے دونوں ہاتھوں کی تالی سی بجاتے ہوئے انگریزی میں کہا:

''او کے۔ تم ہمارے مہمان ہو۔ ممی! ان مہمانوں کے لئے جلدی جلدی وائن تیار کرو، لوسیا تم مکئی کی روٹیاں پکاؤ گی''۔

ریکارڈو نے ہمارا ان دونوں لڑکیوں سے بھی تعارف کرایا۔ ان میں ایک تیکھی اور وحشی آنکھوں والی لڑکی کا نام لوسیا تھا۔ لوسیا نے مجھ سے اور ایلس سے ہاتھ ملایا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ ایلس سے ہاتھ ملاتے ہوئے خوش نہیں تھی۔ وہ ٹماٹروں کی ٹوکری اٹھا کر دوسری طرف چلی گئی۔ دوسری لڑکی چھوٹی عمر کی تھی اور ممی یعنی موٹی خانہ بدوش عورت کے پاس بیٹھی آلو چھیل رہی تھی۔ وہ ہماری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ جو آدمی قریب کھڑا خچر کی مالش کر رہا تھا۔ وہ کبھی کبھی

ہماری طرف دیکھ لیتا تھا۔ ریکارڈو نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

''یہ آیوگو ہے۔۔۔ ہمارا گاڑی بان۔۔۔ باڑا خراب آدمی ہے۔ روز رات کو وائن پی کر ہلڑ بازی کرتا ہے مگر گاتا بڑا اچھا ہے۔ اسے کئی پرانے ہسپانوی گیت یاد ہیں''۔

ریکارڈو نے ایک بار پھر دونوں ہاتھوں کی تالی بجائی اور ایلس کے کندوں پر بازو ڈال کر بولا:

''تم لوگ ہم پر کیا لکھو گے؟ چلو ہم تمہیں اپنی گاڑی دکھاتے ہیں۔ گاڑی کے اندر میں، میری ممی اور میری بیوی لوسیارات کو سوتے ہیں''۔

اور وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ میں ایلس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ ریکارڈو نے ابھی تک اپنا بازو ایلس کے کندھوں پر رکھا ہوا تھا اور ایلس نے ذرا بھی اس کے بازو کو ہٹانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بند گاڑی میں سرخ قالین پر بستر لگا تھا۔ ریشمی تکئے ادھر ادھر پڑے تھے۔ چھت سے لالٹین لٹک رہی تھی۔ دو تین پرانے کمبل اور کپڑوں کا ڈھیر کونے میں لگا تھا۔

ریکارڈو نے لکڑی کی صندوقچی میں سے پتھر کی ڈبی نکالی۔ اسے کھول کر ایلس کو دکھایا۔ میں پاس ہی کھڑا تھا۔ اس میں بھورے رنگ کی راکھ تھی۔ ایلس نے پوچھا:

''کیا یہ کوئی دوائی ہے؟''

ریکارڈو نے ہنس کر کہا:

''یہ سانپ کی راکھ ہے''۔

ایلس نے جلدی سے ہاتھ پیچھے ہٹا لیا۔ ریکارڈو کہہ رہا تھا:

''سوائل کے ایک سنگلاخ علاقے میں سرخ رنگ کا سانپ ہوتا ہے۔ ہم خانہ بدوش اس کو پکڑ کر آگ میں جلاتے ہیں۔ پھر اس کی راکھ سنبھال کر رکھ لیتے ہیں''۔

''یہ کس کام آتی ہے؟'' ایلس نے استفسار کیا۔

ریکارڈو نے میری طرف دیکھ کر آنکھ ماری اور ایلس سے کہا:

''ہفتے میں اس کی ایک خوراک کھانے سے مرد کبھی بوڑھا نہیں ہوتا''۔

اور ریکارڈو قہقہہ لگا کر ہنسا۔ ایلس بالکل نہ شرمائی۔ الٹا اس نے ریکارڈو کا ہاتھ تھام لیا اور پوچھا:

''کیا عورت یہ دوائی نہیں کھا سکتی؟''

ایلس کی اس بے باکی پر ریکارڈو بھی ایک سیکنڈ کے لئے اسکا منہ تکنے لگا۔ پھر اس کی ٹھوڑی کو ہاتھ سے اوپر اٹھاتے ہوئے بولا:

''عورت کو جوان رکھنے کے لئے میرے پاس ایک دوسرا نسخہ ہے۔ میں وہ تمہیں دوں گا''۔

ریکارڈو نے ایک بار پھر میری طرف دیکھ کر آنکھ دبائی۔ ایلس تپائی پر پڑے ہوئے سفید میز پوش کو اٹھا کر دیکھنے لگی۔ اس میز پوش پر ریشمی دھاگوں سے بڑا خوب صورت سرخ گلاب کاڑھا ہوا تھا۔

''یہ کس نے کاڑھا ہے؟'' ایلس نے پوچھا۔

ریکارڈو نے ایلس کے ہاتھ سے رومال لے کر اسے بستر پر پھینک دیا اور بولا:

''لوسیا نے بنایا ہے۔ مجھے ذرا پسند نہیں''۔

ایلس نے پوچھا:

''لوسیا تمہاری بیوی ہے۔ کیا تم لوگ اپنی بیویوں سے محبت نہیں کرتے؟''

ریکارڈو نے بند گاڑی کی چھوٹی سی کھڑکی کھول کر باہر دیکھا۔ پھر سر اندر کر لیا اور ایلس کے قریب ہو کر پوچھا:

''کیا کسی شیر کی بھی شیرنی سے شادی ہوئی ہے؟ شیر تو جنگل کا بادشاہ ہوتا ہے۔ وہ جس شیرنی کو چاہے، اپنی بیوی بنا سکتا ہے۔ میں تمہیں امریکی سگریٹ پلاتا ہوں''۔

اس نے ایک صندوق میں ہاتھ ڈال کر اندر رکھے ہوئے کپڑوں کے نیچے سے امریکی سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور اسے کھول کر ایلس کو سگریٹ پیش کیا۔ ایلس نے سگریٹ پیش کیا۔ ایلس نے سگریٹ سلگا کر ہلکا سا کش لگایا اور کہا:

''شکریہ! تم میرا برانڈ ٹرائی کرو گے''۔

ایلس نے ریکارڈو کو اپنا سگار نما سگریٹ دیا جسے ریکارڈو بڑے شوق سے پینے لگا۔

''تم بڑی اچھی عورت ہو۔ کیا تم میرے ساتھ شادی نہیں کرو گے؟''

ایلس تھوڑا شرمائی۔ ریکارڈو نے ایلس کے کندھے پر ہلکا سا ہاتھ مارا اور بولا:

''باہر آؤ۔۔ تم آ جاؤ مسٹر جوزف! سوری! میں تمہاری بیوی سے زیادہ ہی بے تکلف ہو گیا تھا۔ اصل میں ہم چپسی لوگ تمہاری دنیا کے اخلاقی اصولوں کو نہیں مانتے۔ ہم آزاد ہیں۔ کھلا آسمان۔ کھلے میدان۔ کھلا دل۔۔''۔

اور وہ زور سے ہنسا۔ گاڑی سے باہر آئے تو وہاں کچھ دوسرے خانہ بدوش بھی ممی کے پاس گھاس پر بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔ ہمیں گاڑی سے باہر نکلتے دیکھ کر فوراً چپ ہو گئے۔ ریکارڈو نے ان کی طرف دیکھا اور بلند آواز سے اپنی زبان میں کچھ کہا۔ وہ لوگ اٹھ کر ادھر ادھر مختلف کاموں میں مصروف ہو گئے۔ ایلس نے بعد میں مجھے بتایا کہ ریکارڈو

نے انہیں گالی دے کر کہا تھا کہ وہ ممی کے پاس بیٹھے اس کی چغلیاں تو نہیں کھا رہے؟

دوپہر کو ہم نے ان خانہ بدوشوں کے ساتھ کھانا کھایا۔ آلو تھے۔ مکئی کی روٹیاں تھیں۔ یہ روٹیاں ہماری روٹیوں کی نسبت چھوٹی اور موٹی تھیں مگر آگ پر خوب پکائی گئی تھیں۔ سیب کا مربہ اور بھنا ہوا گوشت تھا۔ ساتھ گھر کی نکالی ہوئی انگور کی وائن تھی جو مجھے کڑوی کڑوی لگی۔ کھانے کے بعد کافی کا دور چلا۔ میں نے دیکھا کہ ریکارڈو کی بیوی لوسینا کا منہ پھولا ہوا تھا اور وہ ایلس سے بات نہیں کرتی تھی۔ ایلس اس کے خاوند ریکارڈو سے بہت بے تکلف ہو رہی تھی۔ ریکارڈو اس کی بے تکلفی سے پورا پورا فائدہ اٹھا رہا تھا۔ ایک دو بار اس نے ایلس کے گال بھی چومے۔ لوسیا اٹھ کر چلی گئی تھی۔

چونکہ ہم نے خانہ بدوشوں کے سامنے خود کو میاں بیوی ظاہر کیا تھا۔ اس لئے رات کو سونے کے لئے ہمیں ایک الگ پھولداری دے دی گئی تھی۔ اس میں صرف ایک دری بچھی تھی۔ جگہ اتنی ہی تھی کہ بمشکل دو آدمی لیٹ سکتے تھے۔ رات کے کھانے کے بعد الاؤ روشن ہو گیا۔ سب خانہ بدوش الاؤ کے گرد بیٹھ گئے۔ ریکارڈو گٹار بجانے لگا۔ اس کی بیوی لوسیا اور چھوٹی دبلی پتلی لڑکی جو ریکارڈو کی کوئی کزن وغیرہ تھی، دونوں سپینی مجیرے بجا کر رقص کرنے لگیں۔ یہ واقعی سپینی خانہ بدوشوں کا خاص رقص تھا۔ دونوں خانہ بدوش لڑکیاں مجیرے بجاتی کبھی تھرک کر، کبھی گھوم کر کبھی بازو نچا نچا کر نیچے سے اوپر لے جاتی رقص کر رہی تھی۔ ریکارڈو نے خوب چڑھا رکھی تھی۔ الاؤ کی روشنی میں اس کے چہرے پر آیا ہوا پسینہ چمک رہا تھا۔ وہ وارفتگی کے ساتھ سر کو جھکائے گٹار بجا رہا تھا۔ لوسیا رقص کرتے کرتے کبھی اس کے قریب آ کر اسے غصے سے دیکھتی۔ پھر اچانک ہونٹوں پر مسکراہٹ لاتی اور تیزی سے گھوم کر پنجوں کے بل گٹار کی تال پر تھرکتی دوسری طرف نکل جاتی۔ اس کی جگہ چھوٹی لڑکی لے لیتی۔ دونوں وحشی ہرنیوں کی طرح رقص کر

رہی تھیں۔ دوسرے خانہ بدوش مرد تالی بجا رہے تھے۔ موٹی خانہ بدوش بھی تالی بجا بجا کر بار بار اولے اولے کہہ رہی تھی۔ ایلس میرے پاس بیٹھی تھی۔ الاؤ کی روشنی میں اس کا چہرہ مجھے صاف نظر آ رہا تھا۔

ایلس رقص کرتی لڑکیوں کو دیکھنے سے زیادہ ریکارڈو کو دیکھ رہی تھی اور ساتھ ساتھ والہانہ انداز میں تالی بھی بجاتی چلی جاتی تھی۔ اچانک ریکارڈو گٹار بجاتے بجاتے اٹھا۔ اس نے گٹار اپنے ساتھ خانہ بدوش کو پکڑائی اور تالی بجا کر کہنیاں اٹھا کر لوسیا اور دوسری لڑکی کے رقص میں شامل ہو گیا۔ ریکارڈو واقعی بڑا ماہر ڈانسر تھا۔ اس نے اتنی تیزی سے دو تین چکر کاٹے کہ سارے خانہ بدوش تالیاں بجا کر اولے اولے پکار اٹھے۔ ریکارڈو اپنی بیوی لوسیا کا ہاتھ تھام کر رقص کرنے لگا۔ لوسیا نے رقص کے دو تین دائرے مکمل کرنے کے بعد اپنے خاوند سے ایک جھٹکے کے ساتھ ہاتھ چھڑا لیا اور دوسری لڑکی کا ہاتھ تھام کر رقص کرنے لگی۔ ریکارڈو نے ایک قہقہہ لگایا اور میرے قریب بیٹھی ہوئی ایلس کا ہاتھ پکڑ کر اسے بھی اپنے رقص میں شامل کر لیا۔ ایلس گویا پہلے سے اس موقع کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ تالی بجا بجا کر ریکارڈو کے ساتھ الٹے سیدھے قدم چلاتی بڑی گرم جوشی سے رقص کرنے لگی۔

ریکارڈو کی بیوی کے چہرے پر رقابت کے تاثرات ابھر آئے۔ وحشی آنکھیں شعلے برسانے لگیں۔ وہ جھنجھلا کر پنجوں کے بل غصے کے عالم میں تھرکتی ہوئی میرے قریب آئی۔ ایک دم سے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اٹھایا اور اپنے ساتھ رقص میں شامل کر لیا۔ میں نے زندگی میں کبھی ڈانس نہیں کیا تھا۔ مگر لوسیا میری طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ میرے کندھے پر رکھ دیا تھا۔ دوسرا ہاتھ کمان کی شکل میں اوپر اٹھا ہوا تھا اور وہ تھرک تھرک کر گٹار کی تال پر ایک ہاتھ سے مجیرے بجاتی رقص کر رہی تھی اور مجھے بھی رقص کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔ مجھ پر گٹار کے

میوزک اور مجیبوں کی آواز نے کچھ ایسی کیفیت طاری کر دی کہ میں بے خود ہو کر رقص کرنے لگا۔ میں لوسیا کی نقل اتار رہا تھا۔ اس نے میری کمر میں ہاتھ ڈالا تو میں نے بھی اس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔ ریکارڈو ایلس کے ساتھ دیوانہ وار رقص میں محو تھا۔ لوسیا نے ایک دم سے مجھے اپنے ساتھ لگا لیا۔ وہ ریکارڈو سے پورا پورا بدلہ لے رہی تھی۔ مگر ریکارڈو پر ذرا سا بھی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ ایلس کے ساتھ رقص میں محو تھا۔

اچانک لوسیا نے مجھے دونوں ہاتھوں سے دھکا دے کر پیچھے گرا دیا اور اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کر بند گاڑی کی طرف بھاگ گئی۔ رقص اور میوزک رک گیا۔ اس وقت ریکارڈو نے ایلس کو اپنے ساتھ لگا رکھا تھا۔ اپنی بیوی کو رقص چھوڑ کر بھاگتے دیکھ اس نے بلند قہقہہ لگایا اور سپینی زبان میں اسے آواز دے کر کچھ کہا اور دوبارہ تالی بجاتے ہوئے ایلس کو رقص میں شریک کرنا چاہا مگر ایلس شاید تھک گئی تھی۔ کیونکہ سپین کا ڈانس تیز ہوتا ہے اور اسکی لے بھی تیز ہوتی ہے۔ آدمی کو اگر مشق نہ ہو تو وہ بہت جلد تھک جاتا ہے۔ ریکارڈو ایلس کا ہاتھ پکڑ کر الاؤ کے پاس لے گیا اور دونوں آپس میں راز نیاز کی باتیں کرنے لگے۔ اس آدمی یعنی ریکارڈو کو نہ تو اپنی بیوی کا کچھ خیال تھا اور نہ اس بات کی پرواہ تھی کہ ایلس جس شخص کی بیوی ہے، (نقلی ہی سہی)، وہ وہیں بیٹھا اسے دیکھ رہا ہے۔ شاید ان لوگوں کے معاشرے میں یہ ایک عام بات تھی مگر ریکارڈو کی بیوی نے اپنے خاوند کو دوسری عورت کے ساتھ رقص کرتے دیکھ کر برا کیوں مانا تھا؟ شاید یہ اس لئے ہو کہ عورت کبھی اس قسم کی بات برداشت نہیں کرتی۔ وہ خواہ کتنی آزاد خیال اور آزاد معاشرے کی کیوں نہ ہو۔ وہ یہ ہرگز برداشت نہیں کرے گی کہ اس کا خاوند اسکی آنکھوں کے سامنے کسی دوسری عورت سے اظہار محبت کرے۔ میں تو ایلس پر حیران تھا کہ اس نے کس بے باکی کے ساتھ ریکارڈو سے عشق شروع کر دیا تھا۔

یہ محفل رات دیر تک جاری رہی۔ پھر سب خانہ بدوش ادھر ادھر پڑ کر سو گئے۔ ریکارڈو ایلس کو چھولداری تک چھوڑنے آیا جو ہمارے لئے وقف کی گئی تھی۔ اس نے انیسویں صدی کے لارڈز کی طرح جھک کر ایلس کا ہاتھ چوما۔ دونوں بازو پھیلا کر اسے گڈ نائیٹ کہا اور چلا گیا۔ ایلس چھولداری میں آ گئی۔ میں پہلے سے اندر دری پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ ایلس کا چہرہ خوشی سے سرخ ہو رہا تھا۔ چھولداری کے بانس کے ساتھ اندر ایک لالٹین روشن تھی۔ وہ ابھی تک اسی کیفیت میں تھی۔ اندر آتے ہی اس نے تالی بجائی۔ کہنیاں اوپر اٹھائیں اور ہسپانوی رقص کی نقل اتارتے ہوئے پنجوں پر تھرکنے لگی۔ پھر خود ہی نڈھال سی ہو کر دری پر بیٹھ گئی۔

''کیوں تمہیں میرا ڈانس پسند نہیں آیا؟''

میں نے کہا:

''یہ بڑا مشکل ڈانس ہے، اس کے لئے بڑی مشق کرنی پڑتی ہے''۔

ایلس نے جوتے اتار کر پرے پھینکتے ہوئے کہا:

''میں ریکارڈو سے یہ ڈانس ضرور سیکھ لوں گی۔ اس نے مجھے بتایا ہے کہ اس رقص کو زبر ایاز مرا رقص کہتے ہیں''۔

اگر ریکارڈو قاتل نہ ہوتا اور میں نے اس خوش پوش نوجوان اونتونیو کو قتل کرتے نہ دیکھا ہوتا تو میں ایلس اور ریکارڈو کے تیزی سے تمام مراحل طے کرتے رومانس میں کبھی دخل نہ دیتا۔ کچھ اس لئے بھی کہ مجھے ایلس سے ہمدردی تھی۔ ایلس ایک صاف دل، صاف ذہن کی سیدھی سادھی عورت تھی۔ مگر عشق کے معاملے میں وہ بڑی شدت پسند ثابت ہو رہی تھی۔ مجھے خطرہ تھا کہ اگر وہ اسی رفتار سے ریکارڈو کی طرف مائل ہوتی گئی تو کسی مشکل میں پھنس سکتی ہے۔ کیا میں اسے بتا دوں کہ ریکارڈو ایک قاتل ہے؟ یہ خیال بار بار میرے دل میں آتا اور میں اسے پرے

ہٹا دیتا۔ میں نے سوچا کہ ایلس کو ویسے ہی ایک دوست کی حیثیت سے تھوڑی بہت نصیحت کر دینی چاہیے۔ اگرچہ یورپ کے معاشرے میں نصیحت نہیں کی جاتی۔ نصیحت کرنے کو لوگ اپنے ذاتی معاملات میں مداخلت تصور کرتے ہیں۔ لیکن وہاں حالات کچھ ایسے پیدا ہو گئے تھے کہ میرے لئے ایلس کو خطرے سے آگاہ کرنا ضروری تھا۔

وہ کمبل کھول کر دری کے اوپر بچھا رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ رقص زمرا رقص کے گیت کے بول بھی گنگنائے جا رہی تھی۔ میں نے سگریٹ زمین پر مسلتے ہوئے کہا:

''ایلس! اگر میں تمہیں ایک بات کہوں تو تم برا تو نہیں مانو گی؟''

''کیوں برا مانوں گی؟'' ایلس نے میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تم میرے بڑے اچھے دوست ہو، بتاؤ کیا بات ہے؟''

میں نے کہا:

''میں دیکھ رہا ہوں کہ تم ریکارڈو سے کچھ زیادہ ہی بے تکلف ہو گئی ہو۔ میں تمہاری مرضی میں کبھی دخل نہیں دوں گا۔ تم اپنے معاملات کو مجھ سے بہتر سمجھتی ہو''۔

''پھر تم کیا کہنا چاہتے ہو؟''

میں نے بڑے محتاط انداز میں کہا:

''میں صرف اتنی بات کہنا چاہتا تھا کہ یہ خانہ بدوش لوگ ہیں۔ مہذب معاشرے کے ادب آداب کی بالکل پروا نہیں کرتے۔ ریکارڈو کے ساتھ تمہاری بے تکلفی نے اس کی بیوی لوسیا کو مشتعل کر دیا ہے۔ یہ وحشی عورتیں ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچائے''۔

ایلس ہلکا سا قہقہہ لگا کر ہنسی:

''تم خالص مشرقی انداز میں سوچتے ہو۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ میں ریکارڈو کو پسند کرنے لگی ہوں۔ اس میں مردانگی کی تمام صفات موجود ہیں۔ مجھے ایسے وحشی لوگ بہت اچھے لگتے ہیں۔ تمہیں یاد ہے کل رات جب تم میرے ساتھ ایک ہی کمبل میں لیٹے تھے تو میں بڑے آرام سے دوسری طرف منہ کر کے سوگئی تھی۔ اس کی وجہ کیا تھی؟ اس کی وجہ صرف اتنی تھی کہ ایک مرد کی حیثیت سے تم مجھے پسند نہیں ہو۔ تم وحشی نہیں ہو، اگر تم ریکارڈو کی طرح وحشی مرد ہوتے تو میں کل رات نہ خود سوتی اور نہ تمہیں سونے دیتی''۔

ایلس اپنا نسواری سگریٹ سلگا کر میرے ساتھ ہی کمبل میں لیٹ گئی۔ میں نے ایلس کی کسی بات کا ذرا بھی برا نہیں مانا تھا۔ میں یورپ کی عورتوں کے مزاج سے واقف تھا۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ ننانوے فی صد یہ عورتیں جھوٹ نہیں بولتیں اور ان کی زبان پر ان کے دل کی بات ہوتی ہے لیکن ایلس کو خطرے سے آگاہ کرنا بھی میں اپنا فرض سمجھتا تھا۔ مشکل یہ تھی کہ جب تک میں ایلس کو یہ نہیں بتاتا کہ ریکارڈو قتل کر کے بھاگا ہوا ہے، حالات کی سنگینی اس کے سامنے واضح نہیں ہو سکتی تھی۔ اس میں بھی ایک مشکل تھی اور مشکل یہ تھی کہ اگر میں ایلس کو یہ بات بتا دیتا ہوں تو خطرہ تھا کہ کہیں وہ ریکارڈو کو جا کر نہ بتا دے کہ میرے ساتھ جو ٹورسٹ سفر کر رہا ہے، یہ میرا خاوند نہیں ہے اور یہ کہ اس نے تمہیں اونتونیو کو قتل کر کے دیکھا ہے۔ پھر میری خیر نہیں تھی۔ میں نے ایلس کو اس حقیقت سے آگاہ کرنے کا خیال دل سے نکال دیا۔ صرف اتنا کہا:

''ایلس! ایک دوست کی حیثیت سے میرا فرض تھا کہ میں تمہیں خطرات سے آگاہ کروں۔ میں نے اپنا فرض پورا کر دیا۔ اب تمہیں اختیار ہے کہ جو چاہے کرو''۔

ایلس نے آگے بڑھ کر میرا ماتھا چوم لیا اور بڑے شفقت بھرے لہجے میں بولی:

''مائی گڈ فرینڈ! تمہارا شکریہ، اب اچھے بچے کی طرح سو جاؤ۔ مجھے بھی نیند آ رہی

ہے"۔

اور وہ میرے ساتھ ہی کمبل میں ٹانگیں سیدھی کر کے لیٹ گئی۔ لالٹین کی روشنی ہم دونوں کے چہروں پر پڑ رہی تھی۔ ایلس کمبل پرے کر کے اٹھی:

"یہ روشنی مجھے سونے نہیں دے گی۔ تمہیں تو روشنی نہیں چاہیے؟"

میں نے دھیمی آواز میں کہا:

"نہیں"

ایلس نے لالٹین بجھا دی۔ اس کے ساتھ ہی چھولداری میں گھپ اندھیرا چھا گیا۔ ایلس ٹٹول کر کمبل تک آئی۔ اندھیرے میں اسکا ہاتھ میرے پیٹ کے ساتھ آ کر لگا تو مجھلے ایلس کی ہنسی کی آواز آئی۔ کہنے لگی:

"کاش تم ریکارڈو کی طرح وحشی آدمی ہوتے۔ مگر تم بڑے شریف آدمی ہو"۔

پھر اس نے اندھیرے میں ہی ٹٹول کر میرے سر پر ہاتھ رکھا۔

"گڈ نائٹ، مائی فرینڈ!"

مجھے ایلس بری لگنے لگی۔ کوئی بھی آدمی پسند نہیں کرتا کہ اس کی مردانگی کا مذاق اڑایا جائے۔ میں نے منہ دوسری طرف کر کے آنکھیں بند کر لیں۔ چھولداری کے کپڑے کے نیچے تھوڑی جگہ خالی تھی۔ لالٹین کے اوپر بھی دھواں نکلنے کے لئے ایک سوراخ رکھا گیا تھا۔ وہاں سے بھی رات کی دھندلی دھندلی روشنی اندر آنے لگی تھی۔ میرا خیال تھا کہ ایلس گھوڑے بیچ کر سو جائے گی اور ابھی اس کے خراٹوں کی آواز آنے لگے گی مگر معلوم ہوتا تھا کہ آج وہ گھوڑے بیچ کر نہیں آئی بلکہ گھوڑے سے مل کر آئی ہے۔ وہ جاگ رہی تھی۔ مجھے اس کے جاگتے میں سانس لینے کی اور کسی وقت گہری آہ بھرنے کی آواز آ رہی تھی۔ میں جان بوجھ کر خاموش رہا اور اس

سے کوئی بات نہ کی۔ میں اب اس سے کوئی فالتو بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ہمیں لیٹے بمشکل دس پندرہ منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ مجھے باہر کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میرے کان کھڑے ہو گئے۔ پھر کسی نے چھولداری کے قریب ہو کر آہستہ سے سیٹی بجائی۔ کمبل کے اندر ایلس کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی۔ اس نے آہستہ سے میرا نام لے کر کہا:

''سو گئے ہو؟''

میں نے کوئی جواب نہ دیا اور یہ ظاہر کیا کہ میں سو گیا ہوں۔ ایلس نے بھی دوسری بار مجھے آواز دینے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ چھولداری کے باہر کسی مرد کی سیٹی کی ہلکی سی آواز پھر آئی۔ ایلس بڑے آرام سے کمبل میں سے نکل گئی۔ چھولداری کا دروازہ جس پر پردہ گرا ہوا تھا، میرے منہ کی جانب تھا۔ میں نے آنکھیں کھول کر اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کی۔ ایلس تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی۔ پردہ ہٹایا اور باہر نکل گئی۔ باہر یقیناً ریکارڈو ہی تھا جو اسے بلانے آیا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ میں نے ایلس کے بارے میں مزید سوچنا بند کر دیا۔ وہ بالغ تھی۔ اپنے برے بھلے کو خود پہچان سکتی تھی۔ اگر وہ ریکارڈو سے عشق کرنے لگی تھی تو وہ جانے اور اس کا کام۔ میں نے سونے کی کوشش شروع کر دی اور پھر مجھے نیند آ گئی۔

مجھے نہیں پتہ کہ رات کتنی گزر گئی تھی کہ جب مجھے محسوس ہوا کہ میرے کمبل میں کوئی گھس رہا ہے۔ میری آنکھ کھل گئی۔ یہ ایلس تھی۔ وہ اس طرح کمبل میں داخل ہونے کی کوشش کر رہی تھی کہ میری نیند نہ کھل جائے۔ مگر میں جاگ پڑا تھا۔ ایلس نے گہرا سانس لیا اور اس کے بعد اس کے جسم نے کوئی حرکت نہ کی۔ میں نے اپنی ٹوٹی ہوئی نیند کے خمار سے اندازہ لگا لیا تھا کہ ایلس کافی دیر کے بعد واپس آئی ہے۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد اس کے مردوں ایسے خراٹوں کی آواز گونجنے لگی۔

اگلے روز میں کافی دیر تک سویا رہا۔ ایلس اٹھ کر جا چکی تھی۔ پھر میں بھی آنکھیں ملتا باہر آ گیا۔ باہر دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ لوسیا، دبلی پتلی لڑکی اور ریکارڈو کی ماں کل کی طرح پتھروں کے بنائے ہوئے چولہے کے پاس آگ جلائے بیٹھی تھیں اور کھانے پینے کے لئے کچھ تیار کر رہی تھیں۔ مجھے آتا دیکھ کر ممی نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی بولنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا:

''تمہاری بیوی باغ میں۔۔۔لیس۔۔۔۔تورو۔۔۔وہ انجیریں لینے گئی ہے''۔

اس نے انگریز کے جتنے لفظ بولے تھے، ان کا مطلب یہی نکلتا تھا جو میں نے اوپر لکھا ہے۔ میں ممی کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ ممی نے مجھے پیالے میں کافی ڈال کر دی۔ ساتھ سوکھے بند کا ایک ٹکڑا بھی دیا۔ لوسیا میری طرف بار بار تیکھی مگر کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنے خاوند کی بے وفائی کا خدا جانے مجھ سے بدلہ لینے کی کیوں کوشش کر رہی تھی۔ میں مزے سے کافی پیتا اور خانہ بدوش ممی سے انگریزی کے لفظ توڑ توڑ کر اس سے باتیں بھی کرتا رہا۔ میں کافی پی چکا تو لوسیا نے میری طرف غصے سے دیکھا باغ کی طرف اشارہ کیا اور کہا:

جاؤ۔ ادھر۔ تمہاری بیوی۔ یو سینوری''۔

اس کی آنکھوں میں مجھے خونخواری نظر آ رہی تھی۔ عجیب مصیبت ہے۔ ایلس کو وحشی مرد مل گیا تھا اور ایک وحشی عورت میرے پلے پڑ گئی تھی۔ میں نے سوچ لیا کہ میں زیادہ دیر تک ان خانہ بدوشوں کے ساتھ نہیں رہ سکوں گا۔ اس کے خاوند ریکارڈو کو تو میں خود اپنی آنکھوں سے قتل کرتے دیکھ چکا ہوں۔ اس سے پہلے نہ جانے یہ کتنے قتل کر چکا ہوگا۔ ایلس جنسی جذبات میں اندھی ہو کر اس کے پیچھے لگ گئی ہے، مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ اپنی جان مصیبت میں ڈالوں۔ ایلس کو جتنا سمجھانا میرا فرض تھا، اتنا میں نے سمجھا کر دیکھ لیا تھا۔ میں نے باغ کی طرف دیکھا۔ اسی وقت باغ کے درختوں میں سے ایلس اور ریکارڈو نکلتے ہوئے دکھائی دیئے۔ انہوں

نے نارنگیوں کی ایک ایک شاخ ہاتھ میں پکڑ رکھی تھی اور ایک دوسرے سے مذاق کرتے ہنستے چلے آ رہے تھے۔

بہت جلد مجھے معلوم ہو گیا کہ خانہ بدوشوں کے قبیلے میں ریکارڈو کا حکم چلتا تھا۔ اس کا بڑا رعب اور دبدبہ تھا۔ اس کے حکم کے آگے کوئی سر نہیں مار سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ریکارڈو کو ایلس سے محبت کرتے دیکھ کر بھی اس کی خانہ بدوش وحشی آنکھوں والی بیوی بے بس تھی۔ وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ اس رات ایلس سونے کے لئے میرے ساتھ کمبل میں لیٹی تو بڑی خوش تھی۔ میں نے اس سے ریکارڈو کے بارے میں بات کی تو وہ بولی:

''خدا نے مجھے جس مرد کے لئے پیدا کیا تھا، وہ مرد مجھے مل گیا ہے۔ اب مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔

میں نے کہا:

''ہو سکتا ہے ریکارڈو کو جس عورت کے لئے قدرت نے پیدا کیا ہے، وہ تم نہ ہو''۔

ایلس نے سگریٹ کا دھواں نتھنوں سے نکالتے ہوئے کہا:

''اگر میں وہ عورت نہیں ہوں تو میں وہ عورت بن کر دکھا دوں گی۔ تم مشرقی لوگ جنس کو بالکل نہیں سمجھتے۔ سیکس ہمارے لئے ایک سائنس ہے۔ ہم اس کے پورے فارمولے پر عمل کرتے ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ ریکارڈو کو کیا چاہیے۔ اسے جو چاہیے، میں اسے مہیا کر رہی ہوں۔ لوسیا اسے وہ کچھ نہیں دے سکی۔ ریکارڈو رات کو مجھے لوسیا کے بارے میں بتا رہا تھا کہ وہ سیکس کی الف ب بھی نہیں جانتی''۔

میں نے ایلس سے پوچھا:

''تو کیا تم ریکارڈو سے شادی کر لو گی؟''

ایلس ہنس پڑی:

''تم لوگ فوراً شادی کی بات شروع کر دیتے ہو۔ تمہارا کیا خیال ہے میں نے ریکارڈو سے شادی نہیں کی؟''

میں نے کہا:

''میرا مطلب ہے کہ لوسیا نے بھی اس سے شادی کی ہے اور وہ اس کے ساتھ رہ رہی ہے۔ اگر تم نے شادی کی ہے تو تمہیں بھی اس کے ساتھ رہنا پڑے گا''۔

ایلس کو وائن کا ہلکا ہلکا سرور تھا۔ کہنے لگی:

''اگر رہنا پڑا تو رہ لوں گی''۔

میں نے کہا:

''لوسیا تمہاری پہلے ہی دشمن ہوگئی ہے، وہ تمہارا وجود کیسے گوارا کرے گی؟''

ایلس کا چہرہ چھولداری میں جلتی ہوئی لالٹین کی روشنی میں مجھے کسی بدمعاش آدمی کا چہرہ لگنے لگا۔ اس نے اپنی مردانہ آواز میں کہا:

''پھر میں اسے اپنے راستے سے ہٹادوں گی۔ میں اسے قتل کردوں گی''۔

اور وہ سر ہلا ہلا کر بڑے سرور میں جپسی نغمہ گنگنانے لگی۔ مجھے اس سے بھی ڈر لگنے لگا۔

ہمارے وہاں آنے کے تیسرے دن بعد خانہ بدوشوں نے وہاں سے کوچ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ میں نے اسی دن ایلس کو چھوڑ کر قرطبہ کی طرف نکل جانے کا پروگرام بنالیا تھا۔ جب مجھے علم ہوا کہ سارے کا سارا قافلہ ہی قرطبہ کی جانب روانہ ہو رہا ہے تو میں رک گیا اور سوچا کہ مجھے شاہراہوں پر لفٹ لے لے کر ہی قرطبہ تک سفر کرنا ہوگا۔ بہتر ہے کہ ان خانہ بدوشوں کے ساتھ ہی سفر کرتا ہوں۔ ایک تو تجربہ بھی ہو جائے گا۔ ان لوگوں کی زندگی کو مزید قریب سے

دیکھنے کا موقع ملے گا اور دوسرے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ ایلس ریکارڈو عشق کا انجام کیا ہوتا ہے؟''

کوچ کی تیاریاں ساری رات ہوتی رہیں۔ کپڑے تھیلوں، گٹھریوں اور لکڑی کے صندوقوں میں بند کئے گئے۔ ریکارڈو اور اسکا گاڑی بان کسی قریب گاؤں میں بھی گئے اور وہاں کسی امیر زمیندار کے گھر سے بڑے قیمتی کپڑے اور کچھ کرنسی نوٹ اور اسکاچ کی شراب کی چار بوتلیں بھی چوری کر کے لائے۔ ریکارڈو سکاچ شراب تھوڑی سی گلاس میں ڈال کر میرے پاس بھی لایا اور بولا:

''سینور! یہ پیئو۔ سکاچ ہے۔ تاسریو کے موٹے زمیندار کے گھر سے سے چوری کر کے لایا ہوں''۔

میں نے ہاتھ سے گلاس کو پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا:

''میں چوری کی شراب نہیں پیتا''۔

ریکارڈو حسب عادت زور سے قہقہہ لگا کر ہنسا اور اپنی ممی کو آواز دے کر کہنے لگا:

''ماما، ماما۔۔۔۔۔۔۔ جوزفو کہتا ہے، میں چوری کی شراب نہیں پیتا''۔

آج خانہ بدوشوں نے رات کو الاؤ روشن نہیں کیا تھا۔ کیونکہ صبح ہونے سے پہلے انہوں نے کوچ کر جانا تھا۔ ریکارڈو کی ممی نے بھی دور سے چیخ مار کر کہا:

''ریکارڈو! لاؤ مجھے لا کر دے دو''۔

''نو، ماما۔۔۔۔۔۔۔۔ نو''۔

اور میرے دیکھتے دیکھتے سارا گلاس چڑھا گیا۔ اس وقت ایلس جو تھوڑی دیر کے لئے سونے کے واسطے چھولداری میں چلی گئی تھی، پردہ ہٹا کر باہر نکل آئی۔ ریکارڈو نے اسے دیکھنے

ہی اپنے دونوں بازو کھول دیئے اور ہاتھوں کو نچاتا ہوا پنجوں کے بل رقص کرنے لگا۔ پھر رقص کرتے کرتے اس نے ایلس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا اور رقص کرتے ہوئے ہی اسے لے کر اس طرف چلا گیا، جدھر اس کی ماما اور دوسری عورتیں سامان وغیرہ گاڑی میں رکھ رہی تھیں۔

میں نے گھڑی پر وقت دیکھا۔ اس وقت رات کے سوا بارہ بج رہے تھے۔ آیوگو میرے قریب سے گزرا تو میں نے اسے کہا:

''آیوگو۔۔۔ کس وقت چلو گے؟''

آیوگو نے منہ سے ادھ جلا سگار نکال کر زور سے تھوکتے ہوئے کہا:

''جب آسمان پر قطبی ستارہ نکلے گا تو کوچ بول دیں گے''۔

مجھے معلوم نہیں تھا کہ آسمان پر قطبی ستارہ کب نکلتا ہے۔ میں نے اسے کہا:

''جب چلنے لگو تو مجھے اٹھا دینا۔ میں سونے جا رہا ہوں''۔

یہ کہہ کر میں چھولداری میں گھس گیا۔ میرا ارادہ تھا کہ جب تک یہ لوگ تیاریوں میں لگے رہیں، تب تک میں تھوڑی نیند پوری کر لوں گا۔ میں چھولداری میں آیا تو دیکھا کہ ایلس نے اپنا بڑا کمبل لپیٹ لپاٹ کر اپنے تھیلے میں بند کر دیا ہوا تھا۔ میرا تھیلا اسی کے پاس ہی پڑا تھا۔ وہاں خنکی تھی۔ لالٹین بانس کے ساتھ جل رہی تھی۔ میں کیا کرتا، خالی دری پر ہی اپنے آپ کو سمیٹ کر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگا۔ مجھے تھوڑی تھوڑی ٹھنڈ لگ رہی تھی۔ پہلے جی چاہا کہ ایلس کے تھیلے میں سے کمبل نکال لوں۔ پھر سوچا کہ یہ غیر اخلاقی حرکت ہوگی۔ ویسے ہی ٹانگیں سینے کے ساتھ لگا کر گیند سا بن کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ سخت تھکا ہوا تھا۔ کچھ وائن کا سرور بھی تھا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے نیند آ گئی۔

جاگ اس وقت کھلی جب خانہ بدوش میرے اوپر سے چھولداری اٹھا کر اسے سمیٹ

رہے تھے۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو مجھے آسمان پر چمکتے تارے نظر آئے۔ آیوگو نے میرے نیچے سے دری کھینچتے ہوئے کہا:

''سینور! اٹھو''۔

اتنے میں ایلس اور ریکارڈو بھی آ گئے۔ انہوں نے بازو میں بازو ڈال رکھے تھے اور نشے کے عالم میں جھوم رہے تھے اور کوئی گیت گا رہے تھے۔ ایلس نے مجھے کہا:

''جوزف! اٹھو، قافلہ کوچ کر رہا ہے''۔

کم بخت شراب کے نشے میں بھی اتنی ہوشیار تھی کہ مجھے اپنا خاوند جوزف ہی ظاہر کیا تھا۔ یا کچھ پتہ نہیں کہ اس نے ریکارڈو کو بتا بھی دیا ہو کہ میں اس کا خاوند نہیں ہوں۔ ضرور اس نے یہ بات ریکارڈو کو بتا دی ہوگی۔ تب ہی ریکارڈو میری بالکل پروا نہیں کرتا تھا۔

ابھی رات کا تیسرا پہر ہی تھا اور آسمان ستاروں سے بھرا ہوا تھا کہ خانہ بدوشوں کا یہ مختصر سا قافلہ قرطبہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ ایلس اور ریکارڈو بند گاڑی میں بیٹھے تھے۔ اس کا ماما بھی ساتھ ہی تھی۔ لوسیا اور اس کی کزن لڑکی دو خچروں پر سوار تھیں۔ مجھے بھی ایک مریل سی خچر دے دی گئی تھی جو فاصلہ کم طے کرتی تھی مگر چلتی بہت تھی۔ آیوگو گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھا خچروں کی باگیں ہاتھوں میں لئے کوئی چسپی گیت گا رہا تھا۔ کھیتوں، باغوں میں سے نکل کر ہمارا خانہ بدوش قافلہ وادی کے پہو میں کھڑی پہاری کے ساتھ ساتھ کچے راستے پر چل پڑا۔ ایلس نے نقشہ دیکھ کر مجھے بتایا تھا کہ ہمیں لوسینا کی پہاڑیوں میں قرطبہ کی طرف کم از کم دو سو کلومیٹر کا سفر طے کرنا ہوگا۔ اسکا مطلب تھا کہ قافلہ اگر اسی رفتار سے چلتا رہا، جس رفتار سے چل رہا ہے، تو بلاشبہ ہم دو مہینوں میں قرطبہ پہنچیں گے۔ میری عجلت پسند طبیعت کو یہ سست روی گوارا نہیں تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہاں سے قرطبہ زیادہ دور نہیں ہوگا اور ہم فاقلے کے ساتھ پہاڑی وادیوں میں سفر کرتے

چھ سات دنوں میں قرطبہ پہنچ جائیں گے۔ لیکن یہاں معاملہ دو مہینوں تک پہنچ گیا تھا۔ میں دو مہینے خچر پر بیٹھ کر سفر نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے دل میں سوچ لیا کہ جہاں کہیں مجھے کوئی شاہراہ دکھائی دی اور سہولت بھی نظر آئی، میں قافلے سے الگ ہو جاؤں گا۔

قافلہ بڑی خوب صورت وادی میں سے گزر رہا تھا۔ دونوں جانب فاصلے پر سرسبز پہاڑیاں تھیں۔ کھیتوں میں کہیں کہیں لوگ کام کر رہے تھے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کوئی نہ کوئی ندی یا چشمہ آ جاتا تھا۔ وہاں خچروں کو اگر ضرورت ہوتی تو پانی پلا دیا جاتا۔ دوسرے لوگ بھی خچروں سے اتر کر منہ ہاتھ دھوتے اور ذرا کی ذرا آرام کرنے کے بعد قافلہ پھر آگے روانہ ہو جاتا۔

اسی طرح دوپہر کا وقت ہو گیا۔ ہم ایک دریا کے شکستہ پل پر سے گزر کر ایک خوب صورت چھوٹی سی وادی میں آئے تھے۔ ریکارڈو نے گاڑی رکوا کر اعلان کر دیا کہ یہاں دوپہر کا کھانا کھایا جائے گا۔ وہیں ایک خیمہ لگا دیا گیا۔ عورتوں نے کھانا پکانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ آیوگو ایک آدمی کے ساتھ کھیتوں میں گیا اور وہاں سے سبزی وغیرہ توڑ کر لے آیا۔ ایلس ریکارڈو کے ساتھ چپکی ہوئی تھی۔ لوسیا اس کی خونخوار نظروں سے دیکھتی اور دانت پیس کر رہ جاتی۔ وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ قافلے نے کوئی دو گھنٹے وہاں قیام کیا۔ کھانا وغیرہ کھایا گیا اور دوبارہ سفر شروع ہو گیا۔ شام ہونے تک ہمارا سفر جاری رہا۔ راستے میں ہم مالٹوں، انجیروں اور انگوروں کے باغوں میں سے گزرے۔ سپین میں پہاڑی چشمے بے شمار ہیں جو وادیوں میں ندی نالوں کی طرح بہتے ہیں اور باغوں کو کھیتوں کو وہیں سے پانی ملتا ہے۔ جب سورج غروب ہو گیا اور پہاڑی ڈھلانوں پر سے رات کے سائے اترنا شروع ہو گئے تو ایک چشمے کے کنارے کھلی جگہ پر قافلہ روک کر ڈیرا ڈال دیا گیا۔ ریکارڈو نے اعلان کیا:

''یہاں ہم رات گزاریں گے''۔

اسی طرح رات کے اندھیرے میں چشمے کے پاس الاؤ روشن کر دیا گیا۔ آگ پر کھانا وغیرہ تیار کیا گیا۔ سب نے وائن سے شغل کیا۔ پھر کھانا کھایا گیا اور معمول کے مطابق جپسی ڈانس شروع ہو گیا۔ مجھے اس سارے عمل میں یکسانیت محسوس ہو رہی تھی۔ ریکارڈو اور ایلس مل کر رقص کرتے رہے۔ لوسیا انہیں کھا جانے والی نظروں سے دیکھتی اور کڑھتی رہی۔ جب رات گہری ہو گئی تو سارے لوگ جہاں بیٹھے تھے، وہیں سو گئے، عورتیں بند گاڑی میں چلی گئیں۔ میرے اور ایلس کے لئے ریکارڈو نے خاص طور پر ایک چھوٹا سا خیمہ لگوا دیا تھا۔ اس میں اس کا ایک خاص مقصد تھا جو مجھے بڑی جلدی معلوم ہو گیا۔

میں خیمے کے اندر گیا تو دیکھا کہ دری کے اوپر ایک پھٹا پرانا گدا بھی پڑا ہے۔ دو تکیے بھی رکھے ہوئے تھے۔ مجھے کچھ تعجب ہوا۔ اتنے میں ایلس بالوں میں چھوٹی کنگھی کرتی اندر آ گئی۔ وہ ہلکے ہلکے سرور میں تھی۔ میں نے کہا:

''یہ گدیلا کس خوشی میں یہاں بچھایا گیا ہے؟''

ایلس کا تھیلا کونے میں میرے تھیلے کے پاس ہی پڑا تھا۔ اس نے تھیلے میں سے چھوٹا شیشہ نکال کر اپنے بالوں کو غور سے دیکھا اور بولی:

''تم میرے بڑے اچھے دوست ہو۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آج کی رات تم خیمے سے باہر کہیں سو جاؤ''۔

میں فوراً سمجھ گیا کہ معاملہ کیا ہے مگر میں انجان بن گیا۔ میں نے پوچھا:

''کیوں آج کیا بات ہے؟''

ایلس میرے پاس آ کر بیٹھ گئی اور میرے رخسار کو بوسہ دے کر کہنے لگی:

''آج ریکارڈو میرے پاس یہاں آئے گا''۔

مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے کہا:

''جب اسے معلوم ہے کہ تم میری بیوی ہو تو پھر وہ یہاں آنے کی جرأت کیسے کرے گا؟''

ایلس نے کہا:

''میں نے اسے بتا دیا ہے کہ تم میرے خاوند نہیں ہو۔ اسی لئے تو وہ آج رات میرے ساتھ اس خیمے میں رہے گا''۔

مجھے اطمینان سا ہو گیا۔ اب میرے ضمیر پر کسی قسم کا بوجھ نہیں تھا۔ میں نے ایلس سے کہا:

''اور اگر اسکی بیوی لوسیا یہاں آ گئی تو کیا ہوگا؟''

ایلس ہاتھ جھٹک کر بولی:

''ریکارڈو کی بیوی تو اس کی لونڈی ہے، اس کی یہ جرأت کہاں کہ وہ رات کو ہمارے خیمے میں آئے''۔

ایلس ٹھیک کہتی تھی۔ لوسیا پر ہر وقت ریکارڈو کی ہیبت چھائی رہتی تھی۔ شاید اسے بھی علم تھا کہ ریکارڈو قاتل ہے بلکہ شاید کئی قتل کر چکا ہے۔ ایلس نے میرا ہاتھ اپنے کھردرے مردانہ ہاتھوں میں تھام لیا اور معذرت بھرے لہجے میں بولی:

''مجھے افسوس ہے کہ تمہیں میری وجہ سے تکلیف ہو گی اور رات باہر گذارنی پڑے گی۔ میں یہ بھی نہیں چاہتی کہ تم کسی دوسرے خانہ بدوش کے خیمے میں جا کر سو رہو۔ اس طرح لوگ شک کریں گے کہ تم اپنی بیوی کو اکیلی خیمے میں چھوڑ کر وہاں کیوں آ گئے ہو۔ کیونکہ سوائے ریکارڈو کے کسی کو معلوم نہیں ہے کہ تم میرے خاوند نہیں ہو۔''

میں نے بے زاری سے کہا:

''ایلس تم میری فکر نہ کرو۔ موسم اتنا ٹھنڈا نہیں ہے۔ میں کھلی جگہ پر گھاس پر سو جاؤں گا۔ مجھے کچھ نہیں ہوتا۔''

باہر خانہ بدوش اپنے اپنے خیموں میں جا چکے تھے اور خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ میں نے تھیلے میں سے سگریٹ کا نیا پیکٹ نکال لیا۔ لائٹر میری جیب میں ہی تھا۔ سگریٹ ضرور ختم ہو گئے تھے۔ نیا پیکٹ میں نے جیب میں ڈالا تو ایلس نے اپنے تھیلے میں سے برانڈی کا پائنٹ نکال کر کھولا۔ اس کے دو گھونٹ چڑھائے اور میری طرف بڑھا کر کہا:

''تم تھوڑی برانڈی ضرور پی لو۔ باہر تمہیں سردی نہیں لگے گی۔''

میں نے برانڈی کے تین چار گھونٹ پی لیے۔ میرا جسم ایکدم گرم ہو گیا۔ اتنے میں خیمے کا پردہ ہٹا اور ریکارڈو اس عالم میں اندر داخل ہوا کہ اس کے ایک ہاتھ میں وائن کی بوتل تھی اور دوسرے ہاتھ میں سگار سلگ رہا تھا۔ وہ تھوڑا تھوڑا ڈول رہا تھا۔ آتے ہی مجھ سے مخاطب ہو کر بولا:

''سینور! مجھے ایلس نے بتا دیا ہے کہ تم اس کے خاوند نہیں ہو۔ اسی لیے میں بے دھڑک یہاں آ گیا ہوں۔''

ایلس نے گدیلے پر ریکارڈو کے لیے جگہ خالی کر دی۔ ریکارڈو گدیلے پر بیٹھ گیا اور بوتل منہ سے لگا کر دو گھونٹ چڑھائے۔ پھر میری طرف دیکھ کر ہنستے ہو کہنے لگا:

''مجھے ایلس سے محبت ہو گئی ہے۔ ہم خانہ بدوش جب کسی عورت سے محبت کرتے ہیں تو پھر اسے ہمیشہ اپنے پاس رکھتے ہیں۔ اب ایلس بھی میرے پاس رہے گی کیوں ایلس؟''

ایلس نے مسکراتے ہوئے ریکارڈو کی کمر میں اپنا بازو حمائل کر دیا اور بولی: یس، یس!''

اور ریکارڈو نے ایلس کو اپنے ساتھ لگا لیا۔ مجھے ہوٹل کے کمرہ نمبر ۲۱ کی وہ رات یاد آ گئی جب میں نے ریکارڈو کو انتونیو کا گلا دباتے دیکھا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ بہت جلد ریکارڈو ایلس کا بھی گلا دبا کر اسے مار ڈالے گا۔ ایلس نے میری طرف دیکھ کر آنکھ سے مجھے باہر جانے کا اشارہ کیا۔ میں پہلے تیار بیٹھا تھا۔ چنانچہ میں اٹھا اور باہر نکل گیا۔ باہر رات کا اندھیرا چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ جس طرف خانہ بدوشوں کی بندگاری کڑھی تھی۔ اس طرف بانس کے ساتھ لٹکی ہوئی ایک لالٹین روشن تھی۔ فضا میں ہوسکتا ہے کہ خنکی ہو مگر چونکہ میں نے برانڈی کے دو چار گھونٹ پی رکھے تھے اس لیے مجھے بالکل سردی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ بلکہ میرا جسم گرم تھا۔ میں نے سوچا کہ رات کسی درخت کے نیچے گذاری جائے۔ کیونکہ وہاں درختوں کے نیچے رات کو اوس نہیں گرتی۔

میں خیمے کے پیچھے سے ہو کر چشمے کے کنارے کنارے چلتا ذرا دور ایک درخت کے پاس آ گیا یہاں مجھے مہندی کے پھولوں کی خوشبوں محسوس ہوئی۔ اس خوشبو نے میرے اندر ایک عجیب انبساط کی کیفیت پیدا کر دی۔

اس خوشبو میں مجھے ہمیشہ مسلمانوں کے عہد حکومت کے اندلس کی خوشبو محسوس ہوئی تھی۔ میں نے سگریٹ سلگایا اور درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ گیا۔ اچانک کسی نے میرے کاندھے پر پیچھے سے ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے گھبرا کر پیچھے دیکھا۔

میرے پیچھے ریکارڈو کی بیوی لوسیا مجھ پر جھکی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں وحشی شیرنی ایسی چمک تھی۔ چہرے پر عجیب تاثرات تھے۔ سیاہ بالوں کی ایک زلف چہرے کے آگے لٹک رہی تھی۔ وہ میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ وہ انگریزی کے ٹوٹے پھوٹے جملے بول لیا کرتی تھی۔ میں یہاں اس کے بے ربط اور شکستہ جملے نہیں لکھوں گا۔ ہمارے درمیان جو گفتگو ہوئی میں

اسے اپنے الفاظ میں بیان کروں گا۔ اس نے مجھے گریبان سے پکڑ لیا:

''تمہاری بیوی نے میرا خاوند چھین لیا ہے۔''

میں نے اپنا گریبان چھڑاتے ہوئے صاف صاف کہہ دیا:

''وہ میری بیوی نہیں ہے؟''

لوسیا نے میرا گریبان چھوڑ دیا اور حیرت سے مجھے تکنے لگی:

''تو پھر وہ کون ہے؟''

میں نے کہا:

''بس وہ میری دوست ہے ہم ایک ساتھ سفر کر رہے تھے وہ میری بیوی بالکل نہیں ہے۔''

لوسیا نے زور سے سانس لیا اور ریکارڈو کو اپنی زبان میں گالی دے کر بولی:

''وہ بڑا بدمعاش ہے غنڈہ ہے اسے ہر رات ایک نئی عورت چاہیے۔ تم دیکھ لینا ایک دن اس کی موت میرے ہاتھوں ہوگی۔''

میں سنبھل کر بیٹھ گیا اور گریبان کا بٹن بند کرنے لگا لوسیا کے پکڑ کر جھنجھوڑنے سے کھل گیا تھا۔ لوسیا اپنے خاوند کے خلاف بولے جا رہی تھی:

اس نے مجھ پر بڑے ظلم کئے ہیں۔ وہ مجھے مارتا بھی ہے مگر میں مجبور ہوں۔ میرا اس دنیا میں سوائے اس کے اور ماما کے اور کوئی نہیں ہے''

میں نے کہا:

''تم اپنے ماں باپ کے پاس کیوں نہیں چلی جاتیں؟''

لوسیا زہر خند کے ساتھ بولی:

''میرے ماں باپ بچپن ہی میں مر گئے تھے۔ وہ بھی حبشی تھے۔ انہوں نے مجھے ماما کے سپرد کر دیا تھا۔ اس وقت میری عمر دس پندرہ سال کی تھی۔ ریکارڈو اوقت پورا جوان تھا۔ اس نے پہلے روز ہی مجھے خراب کر دیا تھا۔ ماما کو معلوم ہوا تو اس نے ریکارڈو سے میری شادی کر دی۔ ریکارڈو کچھ عرصہ مریے ساتھ بڑا خوش رہا اس کے بعد وہ اپنی اصلیت پر واپس آ گیا۔ اس نے دوسری عورتوں سے پینگیں بڑھانی شروع کر دیں۔ میں اسے روکتی تو وہ مجھے بہت مارتا اور پستول نکال لیتا۔''

میں نے سگریٹ بجھا دیا تھا۔ اس خیال سے کہ جلتے سگریٹ کی چمک دیکھ کر کوئی خانہ بدوش یا خود ریکارڈو ہی ادھر نہ آ جائے۔ اگر اسے معلوم ہو گیا کہ میں اس کی بیوی کے پاس بیٹھا ہوں تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ یہ سوچ کر میں اٹھ کھڑا ہوا:

''مجھے تم سے ہمدردی ہے لوسیا۔ مگر میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ میں سونے جا رہا ہوں۔''

لوسیا بھی میرا بازو پکڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور میرے بالکل قریب آ کر بولی:

''تم کہاں سونے جاؤ گے؟ تمہارے خیمے میں تو تمہاری چڑیل دوست میرے خاوند کے ساتھ لیٹی ہے۔''

میں نے کہا:

''یہ ایلس کا ذاتی معاملہ ہے میں اسی لیے باہر آ گیا ہوں میں چشمے کے پار کسی چٹان کے غار میں جا کر سو جاؤں گا۔''

لوسیا میرا بازو دباتے ہوئے بولی:

''ہم اس علاقے سے اکثر گذرتے رہتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے یہاں ایک ٹیلے کے

اندر ایک غار ہے چلو میں تمہیں دکھاتی ہوں۔ تم وہاں سو جانا۔"

وہ مجھے بازو سے کھینچتی ہوئی ایک طرف چل پڑی۔ چشمے کی دوسری طرف درخت ہی درخت تھے جو اندھیرے میں بھوتوں کی طرح کھڑے تھے۔ وہ مجھے اپنے ساتھ کھینچتی ہوئی تیز تیز چل رہی تھی۔ درختوں کی دوسری جانب ایک چھوٹا سا ٹیلہ نظر پڑا۔ لوسیا نے کہا:

"وہ سامنے غار ہے۔"

ٹیلے کی دوسری جانت آئے تو ایک جگہ ٹیلے کی دیوار میں گول تاریک گڑھا سا نظر آیا۔ یہ غار کا منہ تھا۔ لوسیا مجھے کھینچتی ہوئی غار میں داخل ہوگئی۔ غار کی فضا نیم گرم تھی۔ وہاں گھٹ اندھیرا تھا۔ میں جیب سے لائٹر نکال کر جلانے لگا تو لوسیا نے میرا ہاتھ پکڑ لیا:

"اسے کیوں جلاتے ہو؟"

پھر اس نے مجھے دھکا دے کر غار کی دیوار کے ساتھ بیٹھا دیا۔ میں اٹھنے لگا تو لوسیا نے خدا جانے کہاں سے ایک خنجر نکالا اور میرے حلق کے ساتھ اس کی نوک لگا کر غصے سے بولی:

"اگر تم نے بھاگنے کی کوشش کی تو میں تمہیں ہلاک کر دوں گی۔"

میں نے سوچا کہ اب یہاں ذرا حکمت عملی سے کام لینا چاہیے میں بڑی آسانی سے اس کا خنجر چھین کر اسے قابو کر سکتا تھا اور وہاں سے بھاگ سکتا تھا مگر رہ رہ کر میری آنکھوں کے آگے قاتل ریکارڈو کا چہرہ آ جاتا۔ میں سوچتا کہ اگر لوسیا نے شور مچا دیا تو سارے خانہ بدوش یاں آ جائیں گے۔ لوسیا بڑی مکاری سے مجھ پر الزام لگا دے گی کہ میں اسے اٹھا کر یہاں غار میں لے آیا تھا۔ ریکارڈو یہ سمجھے گا کہ میں نے اپنی دوست ایلس ایلس کا بدلہ لینے کی کوشش کی ہے اور پھر وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا میں نے بڑی ملامت سے کہا:

لوسیا! تم کیوں کر کرتی ہو۔ میں کہیں نہیں جاؤں گا اگر مجھے بھاگنا ہوتا تو تمہارے

ساتھ یہاں کیوں آتا۔"

لوسیا نے خنجر پیچھے کرلیا۔اب وہ ایک دم اداس سی ہوگئی مجھے غار کے اندھیرے میں اس کا جھکا ہوا سر صاف نظر آرہا تھا اچانک وہ بھڑک اٹھا اور بولی:

"آخر ریکارڈو اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے۔میں بھی خانہ بدوش باپ کی بیٹی ہوں۔میری رگوں میں بھی خانہ بدوش باپ کا خون دوڑ رہا ہے میں اس سے انتقام لوں گی۔"

اور پھر اس نے اپنا چہرہ میرے قریب کر کے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں مجھے اس کی آنکھوں سے چنگاڑیاں سی پھوٹتی محسوس ہو رہی تھیں کہنے لگی:

"تمہیں ایک بات بتاؤں؟ کسی کو بتاؤ گے تو نہیں؟ اگر یہ بات تم نے اپنی انگریز دوست ایلس کو بتادی تو میں تمہیں اسی خنجر سے مار ڈالوں گی۔"

میں اس کی کوئی بات نہیں سننا چاہتا تھا۔مگر اس وقت میں مجبور تھا۔میں نے کہا:

"نہیں میں کسی کو نہیں بتاؤں گا۔"

"وعدہ"؟

"ہاں وعدہ؟"

"تو سنو.....

ریکارڈو تین خون کر چکا ہے۔تیسرا خون اس نے دو دن پہلے کیا تھا۔وہ رات کو ہمیں جنگل میں چھوڑ کر ایک آدمی کو مارنے قصبے کی طرف گیا تھا واپس آکر اس نے مجھے بتادیا تھا کہ وہ اپنے ایک دشمن کو ہلاک کر کے آرہا ہے۔"

میں خاموشی سے لوسیا کو سن رہا تھا۔وہ پنکارتی ہوئی بولی:

"ریکارڈو کیا سمجھتا ہے اگر میں ذرا پولیس کو بتادوں تو ریکارڈو اسی وقت گرفتار ہو جائے

اور پھر اسے پھانسی ہو جائے میں نے تو ایک بار سوچا تھا کہ قافلہ کسی شہر کے قریب رکے گا تو میں شہر میں جا کر پولیس کو خبر کر دوں گی۔ مگر پھر کچھ سوچ کر میں نے ارادہ بدل لیا۔ سچ پوچھو تو مجھے ماما کا خیال آ جاتا ہے۔ ریکارڈو ماما کا ایک ہی بیٹا ہے۔ اسے پھانسی ہو گئی تو ماما اس کی غم میں مر جائے گی۔"

لوسیا کو یہ بتانے کی میں نے ضرورت ہی محسوس نہیں کی کہ اس کے خاوند نے جو تیسرا خون کیا تھا میں اس کا عینی گواہ ہوں اس وقت میرے سامنے صرف ایک مسئلہ رہ گیا تھا کہ جس طرح بھی ہو سکے میں وہاں سے بھاگ جاؤں۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ میں کوئی پاک باز اور پارسا آدمی تھا نہیں ایسی کوئی بات نہیں تھی میرے اندر بھی اس وقت جوانی کا خون برانڈی کی گرمی سے جوش مار رہا تھا۔ لیکن میں اپنے قارئین کے آگے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ جو سچ بات ہے وہی بیان کروں گا اور وہی لکھوں گا۔ حقیقت یہ تھی کہ میں صرف ریکارڈو سے ڈر رہا تھا صرف ریکارڈو کے خوف کی وجہ سے میں نے اپنے جذبات کو منہ زور گھوڑے کو باگیں کھینچ کر روکے رکھا تھا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ اگر میں نے لوسیا کے ساتھ کوئی ایسی ویسی بات کی تو یہ بات چھپی نہیں رہے گی۔ بہت ممکن ہے جوش رقابت میں آ کر لوسیا خود ریکارڈو کو بتا دے کہ اس نے میرے ساتھ ناجائز تعلقات قائم کر لیے ہیں۔

اگر خود نہیں بتاتی تو وہ کسی دوسرے کو ضرور بتا دے گی کیونکہ اسی طرح سے اس کے جذبہ انتقام کو تسکین مل سکتی تھی۔ اور جب ریکارڈو کو اس بات کا علم ہوا تو پھر میرا زندہ بچنا محال ہو گا۔ میں اگر قافلے سے الگ بھی ہو جاؤں تو بھی ریکارڈو میرا پیچھا کرے گا اور جس طرح اس نے ہوٹل میں آ کر رات کو اونتونیو کو قتل کر دیا تھا اسی طرح وہ مجھے بھی آ کر قتل کر دے گا خواہ میں سپین کے کسی بھی شہر میں کیوں نہ ہوں گا۔

میں خاص حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے لوسیا کی دل جوئی کرنے لگا۔ میں نے ذرا ہمدردی کا اظہار کیا تو لوسیا جیسی وحشی لڑکی کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ وہ اپنا چہرہ میرے کندھے سے لگا کر سسکیاں بھرنے لگی۔ میں اس کو حوصلہ دینے لگا۔

ایک دم سے اس نے سر اٹھایا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر حکم دینے کے انداز میں بولی:

''مجھ سے محبت کرو۔''

میں ذرا سنبھل کر بیٹھ گیا اور کھسیانی سی ہنسی ہنس کر کہا:

''محبت تو میں تمسے کرتا ہوں۔''

لوسیا نے ایک بار پھر خنجر نکال لی اغار کے اندھیرے کی ہماری آنکھیں عادی ہو گئی تھی اور ہمیں ایک دوسرے کے چہرے اور جسم دکھا دے رہے تھے لوسیا نے خنجر کی نوک میری گردن کے ساتھ لگا دی اور حکم دیا:

''محبت کر کے دکھاؤ!''

میں گھبرا گیا۔ میں لوسیا کا مطلب سمجھتا تھا مگر یقین کریں میں ہرگز اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ اسے محبت کر کے دکھاتا۔ فوراً مجھے ایک ترکیب سوجھی میں نے اپنی پسلیوں کے نیچے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:

''لوسیا! میری پسلیوں کے نیچے صبح سے ہلکا ہلکا درد ہو رہا ہے میں نے غرناطہ میں ایک ڈاکٹر کو دکھایا تھا اس نے کہا تھا کہ یہ گردے کا درد ہے اس نے مجھے خبردار کیا تھا کہ اگر تم نے کوئی مشقت کا کام کیا تو گردہ پھٹ جائے گا۔''

میں نے یہ ڈاکٹری مسئلہ خانہ بدوش گنوار لڑکی کو بڑی مشکل سے انگریزی کے الفاظ

ڈھونڈ ڈھونڈ کر سمجھایا میں بڑا حیران ہوا اس پر بڑی جلدی اثر ہو گیا تھا اس نے خنجر سکرٹ یا کرتی میں کہیں چھپایا اور میری پسلیوں پر ہاتھ رکھا کر کہا:

''یہاں درد ہوتا ہے؟''

میں نے جھوٹ موٹ ذرا سا کراہتے ہوئے کہا:

''اف زیادہ نہ دبانا دبانے سے ہی درد ہوتا ہے۔''

لوسیا نے ہاتھ پیچھے کر لیا اور میرا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے لیا اس کی آنکھوں میں مجھے ہمدردی کی چمک نظر آ رہی تھی کہنے لگی:

''ڈاکٹروں کو کیا پتہ تم فکر نہ کرو میں تمہیں ایسی دوا پلاؤں گی کہ درد فوراً ختم ہو جائے گا۔تم مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟''

میں نے مشکل سے سانس لینے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا:

''میں نے سوچا تم خواہ مخواہ پریشان ہو گی ویسے بھی درد ابھی زیادہ نہیں ہے بس ذرا بوجھ ڈالنے سے ٹیس سی اٹھتی ہے۔''

لوسیا نے میرا ماتھا چوم لیا اور ایلس کو گالی دے کر بولی:

''وہ تمہاری دوست نہیں ہے تمہاری دشمن ہے اس نے تمہیں اتنی ٹھنڈ میں رات کے وقت اپنے خیمے سے نکال دیا ہے اور تم بیمار بھی ہو میں اس عورت کا کلیجہ نکال لوں گی تمہیں پتہ ہے ہم خانہ بدوشوں کے پاس ایک ایسا منتر ہوتا ہے کہ جس کو پڑھ کر ہم عورتوں کا کلیجہ نکال لیتی ہیں۔''

میں نے کہا: ''خدا کے لیے ایلس کا کلیجہ نہ نکالنا وہ مر گئی تو ہم سب پکڑے جائیں گے۔''

لوسیا نے اپنے سینے پر ہاتھ مار کر کہا:

''میں وہ عورتوں کا کلیجہ نکال چکی ہوں مجھے تو کسی نے نہیں پکڑا۔''

میں نے خوش تھا کہ میری ترکیب کامیاب ہوگئی ہے میں نے کہا:

''جس عورت کا تم کلیجہ نکالا تھا کیا وہ مرگئی تھی؟''

''کیوں نہ مرتی؟'' لوسیا نے تعجب سے کہا بھلا کلیجہ نکل جانے کے بعد بھی کوئی زندہ رہتا ہے۔''

''تو تم نے اس کی لاش کہاں پھینکی تھی؟''

لوسیا بولی:

''ہم خانہ بدوش جب اپنے کسی دشمن کو مارتے ہیں تو اس کی لاش یونہی نہیں پھینک دیتے ہم رات کے وقت لاش کو خشمے میں لاکر اس کے ہاتھ پاؤں گردن کان ناک کاٹ دیتے ہیں پھر سفر کرتے ہوئے کسی جگہ لاش کا پاؤں زمین میں دفن کر دیتے ہیں تو کسی جگہ اس کا سر دبا دیتے ہیں اس طرح ہم لاش کے ٹکڑوں کو دس بارہ میل کے اندر الگ الگ کر کے دبا دیتے ہیں پولیس کو پتہ نہیں چل سکتا۔''

مجھے لوسیا سے بھی خوف آنے لگا مجھے ایسے لگا جیسے اگر میں مزید دو چار دن اس قافلے کے ساتھ رہا اور لوسیا کے ساتھ محبت کا عملی مظاہرہ نہ کیا تو وہ میرا بھی کلیجہ نکال کر میری لاش کے ٹکڑے جگہ جگہ دفن کر دے گی۔ اس کام میں تو ریکارڈو بھی اس کا ساتھ بٹائے گا کیونکہ میں تو اس کا رقیب روسیاہ ہوگا میں وہاں سے بھاگنے یعنی لوسیا کو محبت و پیار سے راضی کر کے وہاں سے واپس جانے کی سوچنے لگا مجھے یہ بھی ڈر تھا کہ اگر ریکارڈو ایلس کے خیمے سے نکل کر اپنی گاڑی میں آ گیا اور اس نے اپنی بیوی کو وہاں نہ پایا تو وہ یقیناً اس کی تلاش میں نکل پڑے گا اور کوئی

تعجب نہیں کہ اس غار میں بھی آ جائے۔ میں نے پسلی پر اپنا ہاتھ رکھا کر زرا سا کراہا اور کہا:

''لوسیا! اب تم جاؤ میں یہیں آرام کروں گا زیادہ بیٹھنے اور باتیں کرنے سے مجھے درد شروع ہو گیا ہے۔''

لوسیا میری پسلیوں پر بڑی محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی:

''یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں تمہیں اس حالت میں چھوڑ کر چلی جاؤں کیا میں تم سے محبت نہیں کرتی تم یہیں ٹھہرو میں ابھی تمہارے لیے گاڑی میں سے دوائی لے کر آتی ہوں ماما نے ایک ایسی دوائی بنا کر رکھی ہے کہ اس کو کھاتے ہی درد چلا جاتا ہے۔''

میں مزید ڈر گیا۔ مجھے خیال آیا کہ اگر یہ عورت دوا لینے گئی اور اس کی ماما جاگ پڑی یا اس دوران ریکارڈو وہاں آ گیا تو ضرور اس کا پیچھا کرے گا کہ یہ دوائی لے کر رات کے وقت کہاں جا رہی ہے میں نے بے بس سا ہو کر لوسیا کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھاما اور انہیں چوم کر کہا:

''لوسیا! اگر تم مجھ سے سچ مچ محبت کرتی ہو تو پلیز اس وقت مجھے اکیلا چھوڑ دو۔ مجھے نیند بھی آ رہی ہے سو گیا تو درد سے بھی نجات مل جائے ویسے بھی اب درد بہت ہلکا ہو گیا ہے۔''

خدا نے میری فریاد سن لی لوسیا نے اندھیرے میں مجھ پر جھک کر میرا ماتھ چوما اور بولی:

''اچھا میں جاتی ہوں کل رات پھر ملاقات کرنے آؤں گی۔''

وہ اٹھی اور ہرنی کی طرف دوڑتی ہوئی غار سے نکل گئی میں نے اطمینان کا سانس لی اور خدا کا شکر ادا کیا کہ آئی بلا ٹل گئی تھی جاتی دفعہ یہ بلا جو بات کہہ گئی تھی وہ میری سمجھ میں نہیں آئی تھی اس نے کہا تھا کہ کل رات میں پھر ملاقات کرنے آؤں گی۔ کل رات وہ مجھ سے ملاقات کرنے کہاں آنے والی تھی؟

میں نے غار سے نکلتے ہوئے سوچا کہ کل کی کل دیکھی جائے گی غار سے باہر نکل کر میں نے دیکھا کہ رات اسی طرح سر پر تھی سوچا کیوں نہ غار کے پاس ہی کسی جگہ باقی رات بسر کر لی جائے ایک جانت تھوڑی سی کھلی جگہ تھی میں اس طرف گیا غور سے دیکھا وہاں گھاس اگی ہوئی تھی مگر وہ نوکیلی اور جھبنے والی تھی میں درختوں کی طرف آ گیا یہاں ایک درخت کو دیکھا اور وہیں اس کے نیچے بازو سر کے نیچے کر کے اپنے بازو کا تکیہ بیا کر لیٹ گیا دماغ میں طرح طرح کے خیالات آ رہے تھے۔ یہ عورت کل مجھ سے ملنے میرے خیمے میں آ گئی تو ایلس کو پتہ چل جائے گا ہوسکتا ہے ایلس اسکا ذکر ریکارڈو سے کر دے۔ ریکارڈو تو میری جان کا دشمن ہو جائے گا کہ اس کی بیوی مجھے چھپ چھپ کر ملتی ہے عجیب مصیبت میں پھنس گیا تھا۔

میں نے سوچا کہ کیوں نہ کل میں یہاں سے اکیلا ہی تھیلا کاندھے پر ڈال کر کوچ کر جاؤں نہ رہے گا بانس اور نہ بجے گی بانسری آخر مجھے ان لوگوں سے کیا لینا ہے جتنا خانہ بدوشوں کے ساتھ رہ کر تجربہ حاصل کرنا تھا اتنا تجربہ حاصل کر لیا تھا اور یہی تجربہ ساری زندگی کے واسطے کافی تھا وہ جو میں نے اسپینی خانہ بدوشوں کے قافلے کے ساتھ سفر کرنے کا رومانی تصور اپنے دل میں باندھا تھا وہ غارت ہو چکا تھا یہ تو قاتلوں کے ساتھ سفر کرنے کے مترادف تھا۔

خدا جانے کس وقت نیند کی دیوی نے مجھے تھپکیاں دے دے کر سلا دیا آنکھ اس وقت کھلی جب چاروں طرف سنہری دھوپ کی روشنی پھیلی ہوئی تھی میں جلدی سے اٹھا اور چشمے کے پاس بیٹھ کر منہ ہاتھ دھویا۔ رات کے واقعات ایک ڈراؤنے خواب کی طرف لگ رہے تھے میں اوپر سے ہو کر اپنے خیمے میں آیا تو خیمے کے اندر ایلس کمبل اوڑھ کر گہری نیند سو رہی تھی ریکارڈو وہاں نہیں تھا مگر کونے میں اس کی وائن کی خالی بوتل پڑی تھی میری نیند پوری نہیں ہوئی تھی باہر خانہ بدوشوں کے پاس بھی میں نہیں جانا چاہتا تھا پہلے ریکارڈو سے خوف زدہ تھا با اس خوف میں

اس کی وحشی بیوی لوسیا کا خوف بھی شامل ہو گیا تھا۔

ایلس پورے کا پورا کمبل لے کر سو رہی تھی میں اس کے پاس گدیلے پر لیٹ گیا اس خیال سے کہ نرم نرم گدیلے پر تھوڑی دیر آرام کر لوں گا میرے لیٹتے ہی ایلس کی آنکھ کھل گئی اس نے منہ پر سے کمبل ہٹا کر میری طرف دیکھا اس کے بال چہرے پر آئے ہوتے تھے اور آنکھیں نیند کے خمار یا رات بھر کے جگ رتے سے سرخ ہو رہی تھیں میں نے رسمی طور پر گڈ مارننگ کہا اس نے گڈ نائٹ کہہ کر کمبل اوپر کر لیا اور پہلو بدل کر ساکت ہو گئی گدیلے پر بیٹھنے سے مجھے بڑا آرام ملا اور میری آنکھیں ایک بار پھر نیند سے بوجھل ہونے لگیں اس وقت جو دوبارہ سویا تو دوپہر کے قریب آنکھ کھلی مجھے آیو گوگاڑی بان جگا رہا تھا:

''سینورا..... باہر آؤ۔''

میں نے سوچا خدا جانے باہر کیا ہو گیا جو یہ مجھے باہر بلا کر چلا گیا ہے مجھے ڈر تھا کہیں پولیس ریکارڈو کو تلاش کرتی وہاں نہ پہنچ گئی ہو میں جلدی سے باہر نکلا باہر گاڑی کے پاس زمین پر سارے خانہ بدوش بیٹھے تھے کھانا لگا ہوا تھا مجھے دیکھا کر دور سے ریکارڈو نے آواز دی۔ میں قریب چلا گیا ریکارڈو نے سرخ ریشمی رومال گلے میں باندھا ہوا تھا ایلس اس کے پہلو میں بیٹھی تھی لوسیا اور دوسری لڑکی کھانا لگا رہی تھی لوسیا نے میری طرف دیکھا اور ذرا سا مسکرا کر منہ دوسری طرف کر لیا ریکارڈو کی موٹی ماں نے بازو ہلا کر کہا: ''کم سینورے کم۔''

وہ مجھے اپنے پاس بلا رہی تھی اس نے ایک خانہ بدوش کو اٹھا کر میرے لیے جگہ خالی کرا دی میں اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا کھانا سادہ تھا پھل روٹیاں وائن اور انجیروں کی چٹنی..... ریکارڈو کھانا کھاتے ہوئے ہنس ہنس کسی لڑائی کا قصہ اپنے ساتھیوں کو سنا رہا تھا ساتھ ساتھ وہ ایلس کی طرف دیکھ کر مسکراتا جاتا تھا۔ اور اس کی طرف دیکھتا تو انگریزی میں

بولنے لگ جاتا۔ ایلس نے کہا:

''میں سپینی زبان جانتی ہوں۔''

ریکارڈو نے قہقہہ لگا کر کہا:

''میں بھول گیا تھا تم تو اب سپینش جپسی گرل ہو۔''

میں نے لوسیا پر نگاہ ڈالی لوسیا کے چہرے پر نفرت کے تاثرات ابھر آئے تھے اس نے وائن کا گلاس اٹھا کر پورا مشروب حلق میں انڈیل لیا۔ ریکارڈو نے اسے روکتے ہوئے کہا:

''ہے ہے لوسیانو..... کیا کر رہی ہو؟''

لوسیا نے خالی گلاس زور سے ریکارڈو کے اوپر سے دوسری طرف پھینکتے ہوئے غصے میں کہا:

''تم کون ہوتے ہو مجھے روکنے والے۔''

یہ کہہ کر اٹھی اور خیموں کی طرف چلی گئی ریکارڈو نے ایک لمحے کے لیے لوسیا کو جاتے ہوئے دیکھا پھر تالی بجا کر زور سے قہقہہ لگایا۔ سارے خانہ بدوش سوائے ماما کے قہقہے لگانے لگے۔ میں نے پینی میں پوچھا:

''سینور! کیا رات کو یہاں سے چلو گے؟''

اب میں نے اپنی زبان کو رواں کرنے کے لیے اس زبان میں تھوڑی تھوڑی باتیں کرنا شروع کر دی تھیں۔ ریکارڈو نے ایلس کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا اور بولا۔

''سینور! تم سپینش جلد سیکھ جاؤ گے اسی طرح میرے ساتھ بولتے رہو۔''

میں نے اپنا سوال دہرایا تو وہ کہنے لگا:

''ہمیں صبح صبح یہاں سے نکل جانا تھا مگر میری طبعیت ٹھیک نہیں تھی۔ صبح دیر تک سویا

رہا۔ بالکل صبح یہاں سے کوچ کریں گے۔ تم تو ٹھیک سوئے ہو نا؟''

ریکارڈو میری طرف دیکھ کر شرارتی نگاہوں سے مسکرا رہا تھا کیونکہ اس کی وجہ سے مجھے خیمے سے باہر نکال دیا گیا تھا اور وہ اس بات سے واقف تھا۔ میں نے کہا:

''ہاں..... ٹھیک سویا تھا۔''

کھانے کے بعد خیمے میں آ کر سگریٹ پینے لگا۔ ایلس بھی آ گئی۔ وہ کہنے لگی: ر

''چلو باہر چشمے کے پاس بیٹھ کر سگریٹ پیتے ہیں۔ تم سے ایک ضروری مشورہ بھی کرنا ہے۔''

میرا دل تو نہیں چاہتا تھا مگر میں اٹھ کر ایلس کے ساتھ خیمے سے باہر نکل گیا۔

ہم چشمے کے پاس پتھروں پر بیٹھ گئے۔

میں دل میں سوچ رہا تھا کہ ایلس مجھ سے ایسی کون سی ضروری بات کرنا چاہتی ہے ہو سکتا ہے اس پر ریکارڈو کی اصلیت آشکارا ہو گئی ہو۔ رات نشے کی ترنگ میں ریکارڈو نے ایلس کو اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہوں یہ بھی بتا دیا ہوں کہ وہ تین خون کر چکا ہے اور اب ایلس نے اس سے قطع تعلق کر کے وہاں سے نکل جانے کا پروگرام بنایا ہو۔ عورت سیدھی اور صاف گو تھی۔ بیٹھتے ہی بولی:

''میں نے ایک فیصلہ کیا ہے دوست!''

میں اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کا چہرے پر گہری متانت چھائی ہوئی تھی چہرے پر نہ خوشی کے تاثرات تھے نہ غم کے..... ایک دو لمحوں کے لیے وہ بڑا سنجیدہ چہرہ بنا کر میری طرف دیکھتی رہی پھر مسکرائی اور کہا:

''میں نے ریکارڈو سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔''

میں ایلس کے چہرے کو تکتا رہ گیا۔ اس سے پہلے کہ میں سے کوئی سوال کروں اس نے ہاتھ آگے کر کے کہا:

''گھبراؤ نہیں یہ فیصلہ صرف میں نے ہی نہیں کیا اس میں ریکارڈو کی مرضی بھی شامل ہے۔''

تو گویا گذشتہ رات ان دونوں کی فیصلہ کن رات تھی تب مجھے احساس ہوا کہ عورت کتنی ہی چالاک اور سمجھدار کیوں نہ ہو وہ مرد کے بہکاوے میں ضرور آجاتی ہے میں نے ایلس کے فیصلے پر نہ تو خوشی کا اظہار کیا اور نہ ہی اس پر کوئی اعتراض کیا۔ صرف اتنا پوچھا:

''شادی کے بعد یقیناً تم ان لوگوں کے ساتھ ہی رہو گی۔''

ایلس نے چھوٹا سا پتھر اٹھا کر چشمے کے پانی میں پھینکا اور میر طرف دیکھے بغیر پوچھا:

''تمہارا کیا خیال ہے مجھے کہاں رہنا چاہیے۔''

میں نے بڑے اطمینان سے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر سگریٹ سلگایا اور کہا:

''میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ اس لیے کہ یہ تمہارا ذاتی فیصلہ ہے۔''

ایلس نے گردن جھکا کر میری طرف ترچھی نظروں سے دیکھا اور کہا:

''تمہارا کیا خیال ہے کہ مجھے فیصلہ کرنے سے پہلے تم سے مشورہ کرنا چاہیے تھا؟ نو مسٹر! میں نے کبھی اپنی ذاتی زندگی میں کسی کو دخل انداز نہیں ہونے کی اجازت نہیں دی۔''

مجھے بڑا غصہ آیا بھلا مجھے کیا ضرورت تھی اس مرد مار عورت کی ذاتی زندگی میں دخل دینے کی میں نے بھی قدرے تلخ لہجے میں کہا:

''میں نے یہ کب کہا کہ تمہیں ریکارڈو سے شادی کرنے سے پہلے مجھ سے مشورہ کرنا چاہیے تھا۔ تمہاری اپنی زندگی ہے تم اپنی زندگی کے تمام فیصلہ میں خود مختار ہو میں تو ایک دوست

کی حیثت سے پوچھ رہا تھا شادی کے بعد تم ان خانہ بدوشوں کے ساتھ ہی رہو گی یا ریکارڈو کو لے کر لندن چلی جاؤ گی۔"

ایلس نے میرے لہجے کی تلخی کو محسوس کیا تھا میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر معذرت خواہانہ لہجے میں کہنے لگی:

مجھے معاف کر دینا دوست! آئی ایم سوری میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔"

پھر اس نے بھی سگریٹ نکال کر سلگایا ایک لمبا کش لیا۔ حسب عادت آدھا دھواں منہ سے اور آدھا دھواں اپنے نتھنوں سے خارج کرتے ہوئے بولی:

"میں یورپ کی تہذیب سے بیزار ہوں۔ میری سیاحت پر نکلنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی ہم لوگ نیچر سے بہت دور ہو گئے ہیں میں شادی کے بعد ان خانہ بدوشوں کے ساتھ ہی رہوں گی میں بھی ان کی عورتوں کی طرح سرخ واسکٹ اور سیاہ سکرٹ پہن کر زمرا ڈانس کروں گی۔"

میں نے آہستہ سے کہا:

"ریکارڈو کی پہلی بیوی لوسیا کے بارے میں تم نے سوچا ہے کہ اس پر اس شادی کا کیا اثر ہوگا؟"

ایلس نے ہاتھ کو جھٹک دیا:

"ریکارڈو تو اسے اپنی جوتی کے برابر بھی نہیں سمجھتا۔ اور پھر ان لوگوں میں رواج ہے کہ ایک سے زیادہ بیویاں رکھتے ہیں۔"

میں اس کے بعد خاموش ہو گیا اور ریکارڈو سے شادی کرنے کے ضمن میں ایلس سے کوئی سوال نہ کیا کیونکہ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ ایلس اس قاتل کے چنگل میں پوری طرح پھنس چکی ہے اور وہ چند روز یا چند مہینے اس کے جسم سے کھلونے کی طرح کھل کر اسے بھی دھتکار

دے گا۔ میں ایلس کو کوئی مشورہ بھی نہیں دینا چاہتا تھا۔ وہ جس عالم میں بھی اس وقت اس کو اگر سینٹ پال صاحب بھی آ کر کوئی مشورہ دیتے تو ایلس پر اس کے مشورے کا کوئی اثر نہ ہوتا۔ بہر حال میں نے دل میں اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ میں آج کی رات ان خانہ بدوشوں کے ساتھ گذارنے کے بعد صبح صبح وہاں سے فرار ہو جاؤں گا۔ اب میرا وہاں رہنا مناسب نہیں ہوگا۔

اب ایک خطرہ میرے سر پر منڈلا رہا تھا لوسیا نے کہا تھا کہ وہ مجھے رات کو ملنے آئے گی ظاہر ہے اسے اسی خیمے میں رات کو آنا تھا جس خیمے میں میں اور ایلس رات کو سوتے تھے اگر وہ آ گئی تو ایلس کو پتہ چل جائے گا ایلس پہلے ہی ریکارڈو کو لوسیا کے خلاف بدظن کرنے کی کوشش میں تھی وہ چپکے سے جا کر ریکارڈو کو بتا دے گی کہ تمہاری بیوی مسٹر جوزف کے ساتھ عیش کر رہی ہے اس کے بعد جو دھماکہ ہونا تھا اس سے میں اچھی طرح واقف تھا میں نے سوچا کہ میں رات کو ایلس والے خیمے میں نہیں سوؤں گا جنگل میں کسی درخت کے نیچے لیٹ کر رات گذار لوں گا۔

رات ذرا گہری ہوئی تو میں الاؤ کے گرد بیٹھے ہوئے خانہ بدوشوں کے پاس سے اٹھا اور خیمے کی طرف آ گیا۔ میں منہ اندھیرے وہاں سے فرار ہونے کے لیی اپنے سفری تھیلے میں اپنی چیزیں رکھ لینا چاہتا تھا میں تھیلے میں چیزیں ڈال رہا تھا کہ ایلس اندر آ گئی۔

''کیا تم جا رہے ہو؟''

میں نے پلٹ کر اسے دیکھا اور ہنس کر کہا:

''نہیں تو میں کہاں جاؤں گا صبح قافلے کے ساتھ ہی چلوں گا۔''

ایلس میرے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ اس نے میرے کندھے کے ساتھ اپنا گھوڑے کے ننھنوں والا سر لگا دیا اور بولی:

''میں کتنی خوش نصیب ہوں کہ مجھے اپنی پسند کا مرد مل گیا ہے اور ریکارڈو بہادر اور وحشی

آدمی ہے مجھے ایسے مرد بہت پسند ہیں۔"

پھر اپنا سر میرے کندھے سے ہٹا کر کہا:

"کل تو ہم کوچ نہیں کر رہے کل یہاں میری اور ریکارڈو کی شادی کا جشن منایا جائے گا ریکارڈو نے ابھی ابھی فیصلہ کیا ہے ہم دو دن بعد یہاں سے قرطبہ کی طرف چلیں گے۔ کل میں دلہن بنوں گی۔ ماما نے کہاں ہے کہ وہ مجھے بڑی پیاری جپسی دلہن بنائے گی۔ یہ لوگ شادی کے موقع پر ایک مینڈھا ذبح کرتے ہیں ریکارڈو کو مینڈھا چرا کر لانے کے لیے ساتھ والے گاؤں میں ابھی سے بھیج دیا ہے۔"

میں نے ایلس کو بتانے کی ضرورت محسوس نہ کی کہ میں کل صبح وہاں سے چلا جاؤں گا۔ میں نے اسے شادی کی مبارک باد دی اور کہا:

"ایلس! میری دعا ہے کہ تمہاری شادی کامیاب ہو۔"

ایلس نے میرا ماتھا چوم کر میرا شکریہ ادا کیا جب اس نے میرا ماتھا چوما تو مجھے اس کے نتھنوں سے گھوڑے کی بو آئی۔ میں نے تھوڑی دیر کے لیے سانس روک لیا تھا اپنا تھیلا ایک طرف لگا کر میں اٹھا اور ایلس سے کہا میں ذرا چشمے تک سیر کرنے جا رہا ہوں ایلس شادی کی خوشی میں سرشار تھی وہ قالین پر تالی بجا بجا کر تھرک تھرک کر جپسی ڈانس کی نقل اتار رہی تھی۔

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا میں خیمے سے نکل آیا۔ سگریٹ میں نے جیب میں رکھ لیے تھے۔ اس خیال سے کہ لوسیا سے آمنا سامنا نہ ہو جائے میں جدھر خانہ بدوشوں نے الاؤ روشن کر رکھا تھا ادھر نہ گیا بلکہ خیمے کے پیچھے سے ہو کر چشمے سے ذرا دور اس طرف نکل گیا جدھر مہندی کے بے شمار جھاڑ تھے۔ یہاں مہندی کی بہت گہری خوشبو تھی۔ یہ چاند کی تاریخیں نہیں تھی یعنی آسمان پر چاند نکلنے کی راتیں نہیں تھیں۔

راتوں کا اندھیرا اب میرے راستے میں رکاوٹ نہیں بنتا تھا رات اتنی روشن تو نہیں تھی جتنی چاند نکلے تو ہوتی ہے مگر ستارے آسمان پر اتنے زیادہ چمک رہے تھے کہ مہندی کے درختوں میں جاتی پگ ڈنڈیوں کی لکیر مجھ دکھائی دے رہی تھی میں پگ ڈنڈیوں پر چلتا ہوا مہندی کے ایک درخت کے نیچے آ کر بیٹھنے ہی لگا تھا کہ میں لوسیا کی آواز پر چونک اٹھا:

''یہاں کیا کرنے آئے ہو؟ میں نے تمہیں کہا تھا کہ آدمی رات کو تمہارے خیمے میں آؤں گی۔''

میں نے جلدی سے ایک ہاتھ اپنی پسلیوں پر رکھ دیا اور اس طرح درخت کے نیچے بیٹھ گیا جیسے مجھے درد ہو رہا ہو۔ لوسیا جلدی سے میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹی سی شیشی تھی۔ میری پسلیوں پر اپنا ہاتھ آہستہ سے رکھ کر بولی:

''کیا درد ہو رہا ہے؟''

''ہاں لوسیا ہلکا ہلکا درد ہو رہا ہے اسی لیے میں ادھر آ گیا ہوں کہ شائد چلنے پھر سے درد میں افاقہ ہو جائے۔''

لوسیا نے شیشی کا کارک کھولتے ہوئے کہا:

''میں تمہارے لیے تیل لائی ہوں اس کی مالش کرتی ہوں ابھی آرام آ جائے گا۔''

اس نے میری قمیض اوپر کر دی اور تھوڑا سا تیل اپنی ہتھیلی پر ڈال کر میری پسلیوں کی مالش کرنے لگی۔ میں آہستہ آہستہ کراہنے لگا جیسے درد ہو رہا ہو لوسیا نے ایک دم ہاتھ نرم کر لیا بڑی محبت سے بولی:

''میرے ہاتھ میں محبت بھی ہے میری محبت تمہیں ابھی ٹھیک کر دے گی۔''

میں محبت کا نام سن کر کانپ گیا ان خانہ بدوشوں کی محبت سے میں بخوبی واقف ہو گیا تھا

مجھے یقین تھا کہ لوسیا اپنے ساتن خنجر بھی ضرور لائی ہوگی خنجر ان کی محبت کا قومی نشان تھا میں نے سوچا کہ منہ اندھیرے تو مجھے یہاں سے نکل ہی جانا ہے یہ جو کہتی ہے اسے کہنے دو وہ بڑی محبت کے ساتھ میری پسلیوں پر ہاتھ کو بے حد نرم رکھ کر مالش کر رہی تھی کہنے لگی:

''کل ریکارڈو تمہاری دوست سے شادی کر رہا ہے یہاں بڑا جشن ہوگا مگر میں نے بھی ایک فیصلہ کر لیا ہوا ہے۔''

میں نے کراہتے ہوئے پوچھا:

''تم کیا کرو گی؟''

لوسیا مالش کرتے کرتے رک گئی مہندی کے درختوں کے نیم اندھیرے میں اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں کہنے لگی:

''تم کسی سے کہو گے تو نہیں؟''

میں نے یونہی کہہ دیا:

''مجھے کسی سے کہنے کی کیا ضرورت ہے؟''

لوسیا نے اپنی کرتی کے نیچے سے کل والا خنجر نکالا اور اسے میری آنکھوں کے سامنے لا کر کہا:

''میں تمہاری دوست کو آج رات قتل کر دوں گی۔''

''لوسیا! ایسا نہ کرنا پولیس تمہیں پکڑ کر لے جائے گی تمہیں پھانسی کی سزا ہو جائے گی۔''

میں لوسیا کو ڈرا کر ایسے خوف ناک اقدام سے باز رکھنا چاہتا تھا۔

لوسیا نے خنجر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا:

''تو پھر تم اسے قتل کر دو کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتے؟''

میں نے دل پر پتھر رکھ کر کہا:

''ہاں ہاں..... کیوں نہیں..... میں تم سے محبت کرتا ہوں مگر لوسیا میں کسی کو قتل نہیں کر سکتا میں نے یہ کام کبھی نہیں کیا۔''

لوسیا نے خنجر اپنی کرتی کے اندر چھپا لیا اور آرام آرام سے میری پسلیوں پر ہاتھ پھیرنے لگی اچانک اس کا ہاتھ رک گیا۔ اس نے مجھے دونوں کندھوں سے پکڑا اور میرے قریب آ گئی:

''تو پھر چلو ہم دونوں یہاں سے بھاگ جاتے ہیں ہم سیرانوار کی پہاڑیوں کی طرف چلے جائیں گے وہاں ہماری برادری خانہ بدوشوں کے قافلے سفر کرتے رہتے ہیں ہم ان میں شامل ہو جائیں گے اور شادی کر لیں گے۔''

میں دل میں جل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو کا ورد کرنے لگا۔ اوپر سے چپ رہا۔ لوسیا نے مجھے جھنجھوڑا:

''تم بولتے کیوں نہیں؟ کیا مجھ سے شادی نہیں کرو گے؟''

میں ایک دم کراہنے لگا جیسے لوسیا کے جھنجھوڑنے سے پسلیوں کا درد شروع ہو گیا ہو.....

''بڑا درد ہو رہا ہے۔''

لوسیا گھبرا کر مجھ سے معافی مانگنے لگی اور اس کا ہاتھ آہستہ آہستہ میری پسلیوں پر چلنے لگا۔ جب میں نے محسوس کیا کہ وہ اپنا ہاتھ میری پسلیوں سے نیچے لا رہی ہے تو میں نے جلدی سے قمیض نیچے کی اور کہا:

''اب مجھے آرام آ گیا درد بالکل غائب ہو گیا ہے۔''

لوسیا نے ہاتھ کھینچ لیا:

''چلو تمہارے خیمے میں چلتے ہیں وہاں میں سلا کر تمہارے ساتھ لیٹ جاؤں گی رات کو اگر پھر درد ہوا تو میں مالش کر دوں گی۔''

میں نے محسوس کیا کہ حالات خراب سے خراب تر ہونے لگے ہیں اور اب مجھے صبح ہونے کا بھی شاید انتظار کرنا پڑے میں نے لوسیا کو روکنے کی ایک اور کوشش کی میں نے کہا:

''تم پاگل ہو گئی ہو خیمے میں ایلس ہو گی وہ کیا کہے گی۔''

لوسیا نے اسے اپنی زبان میں بڑی فحش گالی دے کر کہا:

''وہ ریکارڈو کے پاس بند گاڑی میں بیٹھی ہے میں نے اسے خود وہاں جاتے دیکھا ہے خیمہ اس وقت خالی ہے چلو اٹھو۔''

مجھے معلوم تھا کہ اگر میں نے انکار کیا تو وہ وحشی عورت دوبارہ خنجر نکال لے گی میں نے پھر آہستہ آہستہ کراہتے ہوئے کہا:

''اف درد پھر شروع ہو گیا ہے ایسا کرو تم خیمے میں جا کر میرا بستر ٹھیک کرو میں تھوڑی دیر کے بعد آتا ہوں۔''

لوسیا نے میرا منہ چوم لیا اس کے منہ سے انگروں کی وائن کی دائن کی تیز بو آ رہی تھی۔

''جلدی آ جانا مجھے نہ آنا پڑے۔''

یہ کہہ کر وہ مہندی کی جھاڑیوں کے اندھیرے میں غائب ہو گئی اس کے جانے کے بعد میں نے سکھ کا لمبا سانس لیا اور سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے یہ فیصلہ میں نے کر لیا تھا کہ وہاں سے ابھی فرار ہو جاؤں گا مگر سوال یہ تھا کہ میرا ٹورسٹ تھیلا خیمے میں تھا اور لوسیا میرے خیمے کے طرف گئی ہے ایک ترکیب میرے ذہن میں آ گئی میں جلدی سے اٹھا اور دوسرے راستے سے اپنے خیمے کی طرف چل پڑا یہ راستہ تھوڑا سا لمبا تھا میں خیمے کے پیچھے جو زیتوں کے جھاڑ تھے

ان کے پاس آ کر راخیمے کی درزوں اور سوراخوں میں سے اندر جلتی لالٹین کی ہلکی ہلکی روشنی باہر نکل رہی تھی۔

میں دبے پاؤں چلتا خیمے کے کپڑے کی دیوار کے پاس آیا اور ایک سوراخ کے ساتھ آنکھ لگا کر اندر دیکھا لوسیا نے ایلس کے کمل کو بڑے سلیقے سے بستر کی طرح بچھا دیا تھا اور خود دونوں بازو سر کے اوپر تک اٹھائے خاموش قدموں پر تھرک تھرک کر جپسی ڈانس کر رہی تھی پھر وہ ایک دم کی اور خیمے کے دروازے کے پاس گئی جہاں پر وہ لٹک رہا تھا اس نے ذرا سا پردہ ہٹا کر باہر دیکھا وہ میرا انتظار کر رہی تھی جب اسے میں نظر نہ آیا تو پردے کو جھٹک دیا کمبل کے بستر پر آ کر بیٹھ گئی پھر نہ جانے اس پر کونسا بھوت سوار ہوا کہ دونوں ہاتھوں سے اپنے جسم کے اوپر والے حصے کی مالش کرنی شروع کر دی پھر ایک دم سے اٹھ کھڑی ہوئی اور ایک بار پھر پردہ ذرا سا ہٹا کر باہر دیکھا اب اس کے چہرے پر غصے کے آثار ظاہر ہونے لگے تھے۔ اس نے زور سے پاؤں زمین پر مارا اور پردہ ہٹا کر تیزی سے باہر نکل گئی۔ میں اسی لمحے کا منتظر تھا۔

جیسے ہی وہ خیمے سے باہر نکلی میں وہیں بیٹھ گیا جب میں نے اندازہ لگایا کہ وہ دور نکل گئی ہوگی تو اٹھا اور خیمے کا چکر کاٹ کر اندر آ گیا اندر آتے ہی میں نے اپنا تھیلا اٹھا کر اپنی کمر پر باندھا ایک نظر چاروں طرف ڈالی کہ میری کوئی شے تو وہاں نہیں رہ گئی اور خیمے سے باہر نکل گیا باہر نکلتے ہی میں خیمے کے عقب میں جو زیتوں کے جھاڑ تھے ان میں سے تیز تیز چلنے لگا۔ میں جلد از جلد خانہ بدوشوں کے ڈیرے سے دور نکل جانا چاہتا تھا اندھیرے میں مجھے کوئی وقت نہیں نہیں رہوی تھی۔ یہ سارا علاقہ میرا دیکھا بھالا تھا۔ اندھیرے میں مجھے کوئی دقت نہیں آ رہی تھی۔ یہ سارا علاقہ میرا دیکھا بھالا تھا ستاروں کی روشنی بھی میری راہ نمائی کر رہی تھی موسم بہار میں وسطی اور جنوبی سپین کے گرم آسمان پر ستارے خوب چمک رہے تھے۔

زیتون کے جھاڑ ختم ہوئے تو آگے کماد کے کھیت شروع ہو گئے۔ ان کے درمیان ایک پگڈنڈی بنی ہوئی تھی میں واقعی اس تیزی سے چل رہا تھا جیسے میرے پیچھے ڈاکو لگے ہوں۔ کھیتوں کا سلسلہ سیب کے باغ تک جاتا تھا۔ یہ جنگلی سیبوں کا باغ تھا جس کے درختوں پر چھوٹے چھوٹے سبز سیب لگتے تھے۔ آیو گوخانہ بدوش یہاں سے چٹنی بنانے کے لیے سیب توڑ کر لاتا تھا۔ میں سیب کے باغ میں سے بھی نکل گیا۔

اب میرے سامنے ایک کھلا میدان تھا جہاں گھاس اگی ہوئی تھی۔ اس کے بعد زمین ڈھلوان ہو گئی۔ میں نے نشیبی علاقے کو دوڑ کر پار کیا۔ آگے ایک پہاڑی نالہ بہہ رہا تھا۔ پتھروں کے ساتھ پانی کے ٹکرانے کی آواز آ رہی تھی۔ چاروں طرف خاموشی اور رات کا دھندلا اندھیرا پھیلا ہوا تھا نالے میں پانی ٹخنوں تک آتا تھا میں نالے میں سے بھی گذر گیا۔ سامنے ایک ٹیلے کی چڑھائی تھی میں چڑھائی چڑھ کر ٹیلے کی دوسری طرف ایک وادی سی پھیلی ہوئی تھی۔ ستاروں کی روشنی میں وہاں کہیں کہیں درختوں کے جھنڈ سیاہ دھبوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ میں نے ذرا نیچے دائیں طرف نگاہ ڈالی تو مدم روشنی دکھائی دی میں اس روشنی کی جانب اترنے لگا یہ ٹیلے کی ڈھلان تھی میں تیز تیز اتر رہا تھا روشنی کے قریب آیا تو دیکھا وہ چھوٹا سا دیہاتی مکان تھا جس کے صحن میں چھپڑ کے نیچے مویشی بندھے ہوئے تھے۔ لالٹین اس چھپڑ کے بانس کے ساتھ لٹک رہی تھی۔ صحن کے گرد کوئی چار فٹ اونچی کچی دیوار تھی ایک جگہ اندر داخل ہونے کے لیے چھوٹا سا راستہ کھلا تھا۔ میں وہاں کھڑا ہو کر سوچنے لگا کہ رات کو اندھیرے میں چلنے سے بہتر ہے کہ میں کسی کو بلا کر پوچھ لوں کہ یہاں سے کسی شاہراہ کی طرف کون سا راستہ جاتا ہے۔

ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ کتے کے بھونکنے کی آواز آنے لگی میں جلدی سے دیوار کے پیچھے ہو گیا اتنے میں کسی نے مکان کا دروازہ کھول کر بلند آواز میں پوچھا:

''کون ہے؟''

یہ کسی عورت کی آواز تھی۔اس نے ہسپانی زبان میں پوچھا تھا۔ہسپانی زبان اب میرے لیے اتنی اجنبی زبان نہیں رہی تھی اس عورت کے ہاتھ میں ٹارچ تھی جس کی روشنی وہ صحن میں چاروں طرف ڈال رہی تھی۔میں دیوار کے پاس وہاں آ گیا جہاں اندر جانے کے لیے راستہ بنا ہوا تھا۔عورت نے میرے اوپر ٹارچ کی روشنی ڈالی اور درشت لہجے میں ایک بار پھر پوچھا:

''کون ہو تم''

میں نے شکستہ ہسپانی زبان میں اسے سمجھاتے ہوئے کہا کہ میں سیاح ہوں راستہ بھول کر ادھر آ نکلا ہوں یہاں سے آگے شہر کی طرف جانے والی سڑک کہاں ملے گی عورت نے ٹارچ کی روشنی نیچے کر لی اور دروازے میں ہی کھڑے کھڑے مجھے اپنی دیہاتی ہسپانی زبان میں جو کچھ بتایا اس کا مطلب میں یہی سمجھ سکا کہ وہاں سے آگے جاؤ۔ایک بارہ دری کا کھنڈر ملے گا اس کے آگے پتھروں کا پرانا پل ہے پل کے پار انگوروں کا باغ ہے باغ کی دوسری طرف ایک سڑک اگلے قصبے کو جاتی ہے میں نے اس ملک کے رواج کے مطابق سر کو ذرا سا جھکا کر اس کا شکریہ ادا کیا اور جس طرف اس نے جانے کیلیے کہا تھا اس طرف چل پڑا۔

کچھ دور چلنے کے بعد بائیں طرف مجھے اندھیرے میں ایک بارہ دری کے کھنڈر کا ہولا سا نظر پڑا۔میں اس کے قریب سے گذرتے ہوئے رک گیا بارہ دری چوکور اور مورش طرز تعمیر کی آئینہ دار تھی یہ اسپین کے مسلمان بادشاہوں کے عہد کی نشانی تھی خدا جانے اس زمانے میں یہاں کوئی باغ تھا یا کیا تھا جس کے درمیان میں یہ بارہ دری تعمیر کی گئی تھی میں نے غور سے دیکھا بارہ دری کی چھت چوکور تھی اور ایک طرف سے ڈھے گئی تھی یہ ایک ویران اور عبرت ناک کھنڈر تھا۔

میں اندلس میں مسلمانوں کے زوال پر غور و فکر کرتا بارہ دری سے آگے نکل گیا۔ستاروں

کی روشنی رات کے اندھیرے میں میری راہ نمائی کر رہی تھی۔ میں ایک کھلے میدان میں سے گذر رہا تھا جہاں زمین پر چھوٹے چھوٹے پتھر بکھرے ہوئے تھے کہیں کہیں جھاڑیوں کے جھنڈ بھی تھے کوئی دو فرلانگ چلا ہوں گا کہ تاریکی میں سے ایک پل کا ہیولا نمودار ہوا قریب جا کر دیکھا تو یہ ایک نشیبی برساتی نالہ کے اوپر بنا ہوا تھا پل بڑے بڑے پتھروں کو جوڑ کر بنایا گیا تھا اس کے نیچے محراب دار ستون تھے جو برساتی نالے کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک چلے گئے تھے میں پل پر سے ہو کر دوسری طرف آ گیا۔ آگے پھر جنگلی جھاڑیوں اور درختوں کے جھنڈ وں والا کھلا میدان تھا۔

میں اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ مجھے انگوروں کے باغ کی تلاش تھی۔ آخری ایک طرف مجھے زمین سے کوئی پانچ چھ فٹ اونچی سبزے کی چھت پڑی ہوئی نظر آئی جو دور تک چلی گئی تھی۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ یہی انگوروں کے کھیت تھے۔ انگوروں کی بیلیں بانس کی چھت ڈال کر اوپر چڑھا دی گئی تھیں۔ ان کے درمیان راستے بنے ہوئے تھے۔ میں انگور کے باغ میں سے گذرنے لگا۔ اندھیرے میں مجھے ہر بانس کی چھت کے ساتھ پتوں میں سے سیاہ اور سرخ انگوروں کے گچھے لٹکتے دکھائی دیئے۔ میں نے ایک گچھا توڑا اور انگور کھاتے ہوئے چلتا گیا۔ انگور ذرا ذرا ترش تھے۔ سپین کے انگور بلکہ سارے یورپ کے اور امریکہ کے انگور ہمارے پیارے پاکستان کے چھوٹے سندر خانی اور لمبوترے موٹے انگوروں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ وہاں ہماری طرح کے انگور بالکل نہیں ہوتے۔ یورپ اور امریکہ کے انگوروں کی جلد سخت اور موٹی ہوتی ہے اور وہ عام طور پر ترش ہوتے ہیں وہ لوگ یہاں آ کر ہمارے سندر خانی اور لمبوترے موٹے انگور کھاتے ہیں تو عش عش کر اٹھتے ہیں اللہ تعالیٰ نے میرے وطن پاکستان کو واقعی ایسی ایسی نعمتوں سے سرفراز فرمایا ہے کہ اگر ہم ساری زندگی اس کا

شکر ادا کرتے رہیں تو بھی حق ادا نہیں ہوگا۔ قائداعظمؒ نے ٹھیک فرمایا تھا کہ خدا نے پاکستان کو لازوال نعمتوں سے مالا مال کیا ہوا ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم متحد ہو کر محنت سے کام کریں اور اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی نعمتوں سے فائدہ اٹھائیں اور ملک کی تعمیر کریں۔

سپین میں ان سرخ اور سیاہ انگوروں کی وائن بنائی جاتی ہے دیہات کے تقریباً ہر گھر کے پیچھے ایک وائن یارڈ ہوتا ہے جہاں انگور کی بلیں بانس کی چھت پر چڑھی ہوتی ہیں۔ گھر کا مالک موسم بہار میں ان انگوروں کی صحن میں ہی آگ جلا کر وائن تیار کرتا ہے اور یہ لوگ سرخ وائن کی بوتلیں بھر کر گھر میں رکھ لیتے ہیں اور اسے خاص تہواروں پر استعمال کرتے ہیں اور مہمانوں کو بھی پیش کرتے ہیں یہاں کھانے کے ساتھ پانی کی جگہ بالعموم انگوروں کی وائن پینے کا بھی عام رواج ہے میں نے یہ وائن پی کر دیکھی ہے اس وائن میں چونکہ الکوحل کی مقدار بے حد معمولی ہوتی ہے اسی لیے اس میں نشہ نہیں ہوتا۔ بس ہلکا ہلکا سرور ہوتا ہے اور یہ بھوک تیز کرتی ہے۔

میں انگور کھاتا باغ میں سے گذر کیا۔ اب پھر کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا سامنے کھیتوں کے پار سرو کے درخت کی ایک سیاہ دیوار کچھ فاصلے پر نظر آئی سرو کے درخت کے مخروطی چوٹیاں ستاروں بھرے آسمان کے پس منظر میں صاف نظر آئی۔ میں چلتے چلتے اب تھکن محسوس کر رہا تھا پہلے تو میں نے سوچا کہ یہیں کسی جگہ پر کر باقی کی رات گذار لیتا ہوں۔ پھر خیال آیا۔ کہ پہلے اس گاؤں میں تو پہنچوں جس کے پاس اس عورت نے بتایا تھا کہ ایک سڑک جاتی ہے میں چلتے چلتے سرو کے درختوں کی قطار کے پاس پہنچا تو مجھے ایک طرف دو تین روشنیاں دکھائی دیں۔ قریب گیا تو یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا کچے سفید مکانوں کے خاکے سے اندھیرے میں نظر آئے۔ دو تین جگہوں پر لالٹینیں روشن تھیں۔ یہاں بجلی نہیں تھی میں ایک باڑے کے قریب سے

گذرا تو یہاں بھی ایک کتا بھونکنے لگا۔ میں کتوں سے بڑا گھبراتا ہوں وہیں رک گیا سوچا اگر باڑے میں سے کتا نکل کر میری طرف آیا تو میں باڑے کی دیوار پر چڑھ جاؤں گا۔ مگر کتا شاید بندھا ہوا تھا وہ مسلسل بھونک رہا تھا۔

اتنے میں ایک آدمی نے اسے گالی دی اور نیند بھری آواز میں بولا:

''باہر کون ہے؟''

میں نے آگے بڑھ کر کہا:

''میں مسافر ہوں۔ راستہ بھول گیا ہوں۔''

ایک آدمی باڑے کا گیٹ کھول کر باہر آ گیا اس کے ہاتھ میں بندوق تھی۔ میری طرف بندوق تان کر بولا:

''تم مجھے کوئی چور لگتے ہو کہاں سے آئے ہو؟''

میں دو قدم آگے ہو گیا۔ اب لالٹین کی روشنی میں ہم ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے۔ یہ بوڑھا دیہاتی تھا جس کی داڑھی بھی تھی سر پر رومال بندھا تھا میں اسے بھی پینی زبان میں سمجھانے لگا کہ میں ٹورسٹ ہوں رات کو نکل پڑا تھا ایک عورت نے پیچھے مجھے بتایا تھا کہ یہاں کوئی سڑک گذرتی ہے مجھے وہاں پہنچنا ہے۔ بوڑھے دیہاتی نے بندوق کی نال نیچے کر دی اور گاؤں کی طرف اشارہ کیا:

''اس طرف سڑک ہے مگر وہاں سے تمہیں اس وقت کوئی سواری نہیں ملے گی۔''

میں واقعی تھکن محسوس کرنے لگا تھا۔ میں نے بوڑھے سے کہا:

''کیا میں یہاں دیوار کے ساتھ لگ کر سو جاؤں؟ تھکا ہوا ہوں..... صبح ہوتے ہی آگے چل دوں گا۔''

بوڑھا دیہاتی ایک دو سیکنڈ خاموشی سے میری طرف دیکھتا رہا۔ پھر باڑے میں جاتے ہوئے بولا:

''میرے ساتھ آؤ اندر سونے کے لیے جگہ ہے۔''

باڑے میں گائے بھینسیں اور دو خچر بندھے ہوئے تھے کتا جو ذرا پرے کہیں بندھا ہوا تھا مسلسل بھونکے جا رہا تھا بوڑھے نے اسے پھر گالی دی وہ چپ ہو گیا یہاں ایک طرف کونے میں لالٹین روشن تھی نیچے زمین پر پرالی قسم کی سوکھی گاس بچھی تھی بوڑھے نے کہا:

''یہاں سو جاؤ۔''

میں نے تھیلا اتار کر اس کا سرہانہ بنایا اور ساپر سر رکھ کر لیٹ گیا بوڑھے نے یاک خچر کے اوپر سے کمبل اتار کر میرے اوپر ڈال دیا:

''جاتے ہوئے یہ کمبل ساتھ نہ لے جانا سو جاؤ۔''

اور وہ کتے کو گالیاں دیتا باڑے کی دوسری طرف چلا گیا شاید وہاں اس نے اپنا بستر لگا رکھا تھا میں نے کلائی لگی گھڑی دیکھی رات کے سوا بارہ بجنے والے تھے میں نے کمبل اوپر کیا اور آنکھیں بند کر لیں کچھ دیر تک مجھے ایلس ریکارڈو اور لوسیا کا خیال آتا رہا پھر میں نے انہیں اپنے ذہن سے جھٹک دیا اب میرا ان لوگوں سے کوئی سروکار نہیں رہا تھا۔ سپین کے خانہ بدوشوں کے ساتھ کچھ وقت گذارنے کا میرا تجربہ کافی تلخ رہا تھا۔

رات کو واقعی میں گھوڑے بیچ کر سویا صبح خوب دھوپ نکلی ہوئی تھی جب میں اٹھا باڑے میں ایک بھینسا یا مینڈھا بے چین ہو کر رسی تڑانے کی کوشش کر رہا تھا شاید اسی کے شور سے میری آنکھ کھل گئی تھی کمبل میں سے گھوڑے کی بو آ رہی تھی حیرانی کی بات ہے ساری رات میں اسی بو کے ساتھ گویا دوسرے لفظوں میں گھوڑے کے ساتھ سویا رہا تھا رات والا بوڑھا کسان دوسری

جانب سے باڑے میں داخل ہوا۔ اس نے مجھے بیدار دیکھا تو دور سے بولا:

''سینور!''

میں اٹھ کر باڑے کی دیوار پر بیٹھ گیا اور سگریٹ سلگا لیا۔ میں ایک کشادہ اور ہرے بھرے میدان کی ڈھائی پر واقع باڑے کی دوار پر تھا۔ بائیں جانب اونچے نیچے کچے مکان تھے۔ مکانوں کی دیواروں پر گیلے کپڑے سوکھنے ڈالے ہوئے تھے دائیں جانب کوئی پھل دار باغ تھا۔ کچھ بچے ایک مکان کے آگے کھیل رہے تھے۔ دھوپ خوب گرم تھی اور جسم کو بڑی اچھی لگ رہی تھی۔ بوڑھا دیہاتی میرے قریب آ گیا وہ رات کے مقابلے میں زیادہ بوڑھا لگ رہا تھا مگر چہرہ لال سرخ تھا کہنے لگا:

''چلو کچھ ناشتہ کر لو سینور..... پھر چلے جانا۔''

وہ مجھے ایک مکان میں لے گیا صحن میں پتلی چھاؤں والے درخت کے نیچے لکڑی کے تختے جوڑ کر بنایا گیا میز لگا تھا۔ مکان کا دصر دروازہ میکسیکو کے دیہاتی مکانوں کی طرح محراب دار تھا اور اس کی ایک جانب بوگن ویلیا کی بیل چڑھی ہوئی تھی۔ میکسیکو کے کلچر پر بھی سپین کی وساطت سے مور مسلمانوں کے کلچر کی چھاپ ہے۔ ایک دیہاتی عورت لمبا فراک پہنے تندور کے پاس کھڑی اس میں سے کلچے کے سائز کی گرم گرم سرخ روٹیاں نکال رہی تھی۔ میں نے ان روٹیوں کے ساتھ رات کا بھنا ہوا گوشت کھایا ساتھ انور کا مربہ بھی تھا دیہاتی عورت نے واؤن کی بوتل بھی میز پر رکھ دی تھی مگر صبح صبح وائن نہیں پینا چاہتا تھا اصل میں وائن ان کے لیے روزمرہ کے استعمال کا مشروب ہے آپ پئیں چاہے نہیں پئیں لال رنگ کی بوتل میز پر ضرور لا کر رکھ دی جاتی ہے ان لوگوں کی سپینی زبان دیہاتی تھی جس کے اکثر الفاظ اور لہجہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا پھر بھی میرے پوچھنے پر بوڑھے نے مجھے جو کچھ بتایا تھا وہ یہ تھا کہ اس گاؤں سے آگے دس بارہ

کلومیٹر کے فاصلے پر ایک ذرا بڑا گاؤں آتا تھا جس کا نام میری سمجھ میں کستادیہ آیا۔

''وہاں سے لاری جیکو لاش تک جاتی ہے جیکو لاش سے قرطبہ کا پہاڑی علاقہ اور وادیاں شروع ہو جاتی ہیں۔''

خدا جانے اس قصبے کا نام جہاں سے قرطبہ کی وادیاں شروع ہوتی تھیں جیکو لاش تھا یا بوڑھے نے جیکتو لاش بتایا تھا۔ بہر حال یہ گاؤں یا قصبہ کستادیہ گاؤں سے آگے تھا اور کستادیہ سے مجھے لاری مل سکتی تھی ناشتہ کرنے کے بعد می نے میزبانوں کا شکریہ ادا کیا ان کا مصافحہ کیا اور اللہ کا نام لے کر کستادیہ گاؤں کو جانے والی سڑک یک تلاش میں کھیتوں اور باغات کی طرف روانہ ہو گیا کستادیہ تک مجھے دس بارہ کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنا تھا۔ راستے میں انگور اور انجیر کے تین چار باغ آئے جہاں ہسپانوی کسان اور مزدور کام کر رہے تھے ایک کھجوروں کا باغ آیا۔ نسواری اور زرد رنگ کی چمک دار کھجوریں زمین پر گری پڑی تھیں۔ میں نے کھجوریں اٹھا کر عرب ملسمانوں کا تحفہ سمجھ کر بڑے مزے سے کھائیں۔

آگے ایک کچی سی سڑک مل گئی چونکہ یہ سارا علاقہ پہاڑی تھا اس لیے سڑک پر گردنہ ہونے کے برابر تھی سنگریزے ہر طرف بکھرے ہوئے تھے یہ سڑک ایک چشمے کے پانی میں جا کر ڈوب گئی تھی اور دوسرے کنارے سے باہر نکل آئی تنی جشاغ مل پلتی شفاف اور ٹھنڈا تھا۔ میں نے وہاں بیٹھ کر تھوڑی دیر آرام کیا اس کے بعد اٹھا اور تازہ دم ہو کر دوبارہ اپنے سفر پر چل پڑا میں کچی سڑک کے کنارے کنارے جھاڑیوں کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

مجھے بوڑھے دیہاتی کے بیان کے مطابق اسی سڑک پر دس بارہ کلومیٹر کا فاصلہ پیدل ہی طے کرنا تھا۔ میرے لیے یہ فاصلہ کوئی زیادہ نہیں تھا اس سے پہلے میں نے پندرہ پندرہ بیس بیس میل کا فاصلہ ایک ہی وقت میں مسلسل چلتے ہوئے طے کیا تھا موسم گرم ہو رہا تھا اور دھوپ میں

چلنے کی وجہ سے مجھے پسینہ آنے لگا تھا میں آہستہ آہستہ چلنے لگا دو تین میل چلا ہوں گا کہ پیچھے سے مجھے خچر کے بھاری ٹاپوں کی آواز سنائی دی سپین میں میں اس آواز سے آشنا ہو چکا تھا خاص طور پر دیہات میں یہاں خچر ہی بار برداری وغیرہ کے کام کے لیے استعمال میں لائے جاتے تھے۔

میں نے کھڑے ہو کر پیچھے مڑ کر دیکھا ایک گڈا چلا آ رہا تھا جس کے آگے دو خچر جتے ہوئے تھے جب گڈا میرے قریب آیا تو میں نے دیکھا کہ اس پر انگوروں کے بھرے ہوئے کھوکھلے لدے ہوئے تھے۔ گڈے کی گاودی پر ایک نوجوان ہسپانیو کسان سر پر تنکوں کا گول ہیٹ پہنے بیٹھا تھا میں نے ہاتھ کا اشارہ کیا تو اس نے گڈا روک کر مجھ سے خندہ پیشانی کے ساتھ سپینی میں جو پوچھا اس کا مطلب یہی تھا کہ مجھے کہاں جانا ہے میں نے کستادیہ کا نام لیا نوجوان کستان نے گڈے کے اوپر کی طرف اشارہ کر کے کہا:

''اوپر..... بیٹھ جاؤ''

میں گڈے کے لوہے کے پہیے پر پاؤں رکھا کر اوپر چڑھا اور انگوروں کے کھوکھوں پر بیٹھ گیا گڈا آگے چل پڑا خچر ایک نپی تلی چال سے چل رہے تھے۔ سپینی نوجوان نے گانا شروع کر دیا پہلے مجھے لگا کہ وہ کوئی عربی لوک گیت گا رہا ہے مگر نہیں وہ سپینش لوک گیت تھا جس پر ظاہر ہے عربی لے اور عربی میوزک کا اثر غالب تھا۔

دونوں جانب ہرے بھرے کھیت تھے ایک جگہ گڈے نے ایک سرسبز ٹیلے کا چکر بھی کاٹا ٹیلے کا ڈھلانیں درختوں سے ڈھکی ہوئی تھیں کستادیہ تک راستے میں ہم کئی ندی نالوں چشموں سے گذرے ایک پرانا پتھروں کا پل بھی دیکھا جس کی خستگی بتا رہی تھی کہ مسلمانوں کے دور حکومت کی یادگار ہے راستے میں جتنے گاؤں آئے ان میں چھوٹا سا گرجا اور اس کا مینار ضرور نظر آیا کستادیہ کا قصبہ کافی بڑا تھا وہاں ٹیلوں اور میدانوں میں اونچے نیچے ڈربہ نما بے ہنگم مکانات

تھے اکثر مکانات کی دیواریں پھول دار بیلوں میں چھپی ہوئی تھیں گڈا پھلوں کی منڈی کے باہر جا کر رک گیا میں نے نیچے اتر کر نوجوان کسان کا شکریہ ادا کیا وہ مسکرانے لگا کستادیہ کا ایک ہی بازار تھا جو کافی گنجان تھا ڈھیلے ڈھالے پرانے کپڑوں والے کسان دکانوں پر منڈلا رہے تھے ایک کھڑکھڑاتی ہوئی لاری میرے قریب سے گذر گئی۔ اس کا کنڈکٹر ہمارے لاہور کے ویگنوں کے کنڈکٹروں کی طرح دروازے میں لٹکا ہوا تھا اور کولاش کولاش کی آوازیں لگا رہا تھا پہلے تو میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ یہ کیا کہہ رہا ہے اچانک مجھے خیال آیا کہ کہیں یہ اسی شہر جیکو لاش کا نام تو نہیں لے رہا جو بوڑھے ہسپانوی نے مجھے بتایا تھا میں لاری کے پیچھے دوڑ پڑا۔ لاری آگے ایک جگہ پہنچ کر رک گئی۔ یہاں کچھ سواریاں اتر گئیں یہ لاری جیکو لاش ہی جا رہی تھی جس کو لوگ عام طور پر کولاش ہی کہہ کر پکارتے تھے۔

میں بھی دوسرے مسافروں کے ساتھ لاری میں بیٹھ گیا ہمارے لاہور کے ویگنوں کی طرف وہاں بھی کنڈکٹر نے لاری چلنے کے بعد کٹ دینے شروع کئے۔ میں نے اس سے پینی زبان میں پوچھا:

''کولاش کتنی دور ہے؟''

کنڈکٹر نے لاری کے پرانے انجن کے شور میں چیخ کر کہا: ''پندرہ میٹر سینور!''

میں مسافروں میں پھنس کر بیٹھا ہوا تھا سارا راستہ اسی طرح بیٹھا رہا کھڑکیوں میں سے باہر کا نظارہ دیکھ لیتا تھا زمین کے مناظر زیادہ خوب صورت ہوتے جا رہے تھے دور پہاڑیوں پر سرو کے درختوں کے جھنڈ اور کہیں کہیں کسی پرانے قلعے کے چوکور مینار سیاہ فصیلوں کے کونوں پر ابھرے ہوئے نظر آجاتے تھے یہ سارے دیہاتی تھے اور اونچی آواز میں باتیں کر رہے تھے سارا رستہ لاری کی فضا تیز آوازوں اور گھٹیا سگریٹ کے دھوئیں سے بھری رہی اگر باہر کی تازہ ہوا

کھڑکیوں میں سے اندر نہ آ رہی ہوتی تو میر برا حال ہو جاتا۔

لاری کولاش یا جیکو لاش کے بڑے قصبے میں پہنچی تو دوپہر ہو رہی تھی یہ قصبہ کافی بڑا تھا گذرتی لاری میں سے اس کی تنگ پتلی پتلی نیچے کو اترتی گلیاں اور مکانوں کے چھجوں پر لٹکتے گملے صاف نظر آ رہے تھے۔ایک جگہ سبز تربوزوں کے ڈھیر پڑے دیکھے مجھے لاہور کا چوک شاہدرہ یاد آ گیا وہاں بھی گرمیوں میں اسی طرح تربوزوں کے ڈھیروں کے ڈھیر بکتے ہیں میں نے دیکھے ہوئے تھے کولاش کی ایک چھوٹی سی دوکان کے باہر لمبی میز کے آگے بیٹھ کر میں نے کھانا کھایا۔کافی پی اور معلوم کیا کہ یہاں سے قرطبہ کتنی دور ہے اور کونسی بس وہاں جاتی ہے اور کب جاتی ہے۔

مجھے بتایا گیا کہ قرطبہ وہاں سے ستر اسی کلومیٹر کے فاصلے پر رہ گیا ہے اور دن میں کوئی چار بسیں قصبے کے گنجان بازار کے بس سٹینڈ سے چلتی ہیں میں اس بس سٹینڈ پر آ گیا پتہ چلا کہ ایک بس ابھی ابھی قرطبہ کی طرف نکل گئی ہے اب دوسری بس دو گھنٹے بعد جائے گی میں بڑا گھبرا رہا تھا ستر اسی کلومیٹر کا فاصلہ دیہاتی بس کے گھٹے ہوئے شور آلود ماحول میں گذارنا پڑے گا مگر مجبور تھی دوسرا کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا پیدل اتنی دور دلنے کو اب دل نہیں مانتا تھا اندلس کا سب سے اہم ترین تاریخی شہر قرطبہ..... مسجد قرطبہ والا شہر قرطبہ..... قریب تھا اور میں بہت جلد وہاں پہنچنا چاہتا تھا بلکہ اڑ کر پہنچنا چاہتا تھا میرے لیے دو گھنٹے گذارنے مشکل ہو رہے تھے میں بس کے اڈے میں ادھر ادھر پھرنے لگا ایک جگہ میں نے دو نوجوان لڑکوں کو دیکھا انہوں نے تنگ پتلونیں اور جیکٹیں پہن رکھی تھیں اور وہ گٹار بجا کر زمرا ڈانس کر رہے تھے لوگ ارد گرد کھڑے تالیں بجا بجا کر انہیں داد دے رہے تھے میں قصبے کی گلیوں میں نکل گیا یہ بڑی چھوٹی گلیاں تھیں جگہ جگہ کے گندگی کے ڈھیر لگے تھے۔ایک مکان کی گیلری سے میرے سامنے ایک عورت

نے کوڑے کا ڈبہ نیچے انڈیل دیا۔

مکانوں کے دیہاتی دروازوں پر لوہے کے بڑے بڑے کنڈے لٹک رہے تھے ایک مکان کے قریب سے گذرا تو کسی لڑکی کے نقرئی قہقہے کی آواز آئی میرا دل ایک عجیب درد انگیز اداسی سے بھر گیا میں نے سوچا آج سے چھ سات سو برس پہلے یہ محلے شادی اسی طرح آباد تھے اور یہاں مصر شام عرب اور مرکش کے مسلمان کنبے رہا کرتے تھے اور اسی طرح ان مکانوں میں مسلمان بچوں کی آوازیں گونجا کرتی تھیں آج یہاں ایک بھی مسلمان نہیں ہے قصبے کے دوسرے کونے میں مجھے ایک مینار نظر پڑا۔ اس کا طرز تعمیر مورش تھا یعنی یہ چوکور مینار تھا اور صاف لگ رہا تھا کہ یہ کسی مسجد کا مینار ہے قریب گیا تو معلوم ہوا کہ یہ گرجا گھر ہے اور مینار کسی پرانی تاریخی مسجد ہی کا ہے جس کا گنبد ڈھا دیا گیا ہے وہاں گجا بن گیا ہے اور مینار کے ساتھ زنجیر لٹکی ہوئی ہے اوپر مینار پر گرجے کی گھنٹی لگی ہوئی ہے زنجیر نیچے سے کھینچتے ہیں تو اوپر گرجے کی گھنٹی بجنے لگتی ہے گویا یہ ایک مسجد تھی جسے کلیسا میں تبدیل کر دیا گیا تھا بعد میں میں نے بارسلونا سیوائل اور قرطبہ کے شہر اور قرب وجوار میں ایسی کئی تاریخی مسجدیں دیکھیں جنہیں گرجا گھروں میں تبدیل کر دیا گیا تھا مگر مینار نہیں توڑے گئے تھے ان میناروں کو گرجا گھروں کی گھنٹیاں بجانے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا گویا مسجد کا یہ مینار اب گرجا گھر کا مینار تھا۔

میں اس قدیم مسجد اور جدید عہد کے گرجا گھر پر ایک عبرت انگیز نگاہ ڈالتا ہوا آنکھوں میں آنسو لیے وہاں سے واپس ہرا اور بس سٹینڈ میں آ کر بیٹھ گیا۔ کافی دیر بعد پیچھے سے ایک بس آئی۔ اس بس کو قرطبہ جانا تھا۔ دیکھتے دیکھتے بس سواریوں سے بھر گئی مجھے بھی ایک کونے میں جگہ مل گئی تھی سہ پہر کے بعد بس خدا خدا کر کے روانہ ہوئی۔ قرطبہ جانے والی یہ پہاڑی سڑک نسبتاً اچھی اور ذرا کشادہ تھی بس کی رفتار بھی اچھی خاصی تیز تھی ڈرائیور نے سامنے چاندی کی

چھوٹی سی صلیب لٹکا رکھی تھی۔ جس طرح ہمارے ہاں بعض لوگ تسبیح لٹکا لیتے ہیں سورج نے شمال مغرب کی پہاڑیوں کے سائے لمبے ہونے لگے تھے جگہ جگہ کھجور اور سرو کے درخت ھنڈوں کے شکل میں نظر آ رہے تھے ٹیلوں کی ڈھلانوں پر کچے سفید مکان بنے ہوئے تھے بس ایک کشادہ وادی میں سے گذر رہی تھی جیسے جیسے قرطبہ کی پہاڑیاں نزدیک آ رہی تھیں مناظر خوب صورت اور دل آویز ہو رہے تھے بڑا سرسبز اور شاداب علاقہ شروع ہو گیا تھا بس ایک دریا کے اوپر سے گذری۔ کسی نے اس کا نام لیا وہ نام مجھے اب یاد نہیں رہا کھیتوں میں ہری بھری فصلیں کھڑی تھیں جہاں فصل کٹی ہوئی تھی وہاں ہسپانوی مرد اور عورتیں خچر گاڑیوں پر ہرے بھرے اور سنہری گٹھے لاد رہی تھیں بس کی کھڑکیوں میں سے جو ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی اس میں کھیتوں جنگلی پھلوں اور چشموں ندیوں کی موطوب مہک رچی بسی ہوئی تھی اس خیال سے میرا دل ایک عجیب سرمدی سرور سے لبریز تھا کہ میں اندلس کے تاریخی شہر قرطبہ کی طرف بڑھ رہا ہوں جہاں مسجد قرطبہ کی زیارت کروں گا اور وہاں دو نفل پڑھنے کی سعادت حاصل کروں گا اگرچہ میں سال چھ مہینے میں ہی کبھی کوئی نماز پڑھتا تھا لیکن مسجد قرطبہ میں نماز پڑھنے یا دو نفل ادا کرنے کی خواہش میں دل لیئے لاہور سے سوئے قرطبہ چلا تھا۔ اچانک بس کو ایک دھچکا لگا اور وہ تھوڑی دور جا کر سڑک کے کنارے رک گئی۔

معلوم ہوا کہ بس کا ٹائی راڈ ٹوٹ گیا ہے۔

یہ بڑی غنیمت ہوئی کہ جس وقت ٹائی راڈ ٹوٹا اس وقت بس ایک چوڑے پاٹ والے پہاڑی نالے کے پتھروں کے اوپر سے گذر کر سڑک پر چڑھی ہی تھی اور اس کی رفتار بہت ہلکی تھی ورنہ بس کے الٹنے یا کسی درخت سے ٹکرا جانے کا خطرہ تھا مسافر بے چینی سے ڈرائیور سے سوال کرنے لگے کیا ہو گیا بس کتنی دیر رکے گی وغیرہ ڈور ائیور سڑک پر بیٹھا سر جھکا کر بس کے نیچے

دیکھا رہا تھا اس نے اٹھتے ہی اعلان کر دیا کہ یہ بس یہیں کھڑی رہے گی پیچھے سے دوسری بس آئے گی سارے مسافر اس میں بیٹھ کر آگے چلے جائیں۔ مسافر بڑبڑاتے اور بس کمپنی کو برا بھلا کہتے نیچے اتر آئے۔

میں بھی بس سے اتر آیا بڑی پریشان کر دینے والی صورت حال پیدا ہو گئی تھی کہاں میں یہ سوچ کر خوش ہو رہا تھا کہ گھنٹے ڈیڑھ بعد مسجد قرطبہ کے دروازے کے سامنے کھڑا اس کے جاہ جلال کو دیکھ کر دم بخود ہوں گا اور کہاں اب دوسرے مسافروں کے ساتھ سڑک کے کنارے بے یقینی کی حالت میں کھڑا تھا۔ کوئی پتہ نہیں تھا کہ پیچھے سے بس کب آئے گی۔ سڑک آگے پیچھے دور تک سنسنان تھی۔ سورج دور پہاڑی سلسلے کے پیچھے غروب ہونے کی تیاریاں کر رہا تھا۔

مسافروں میں زیادہ تر دیہاتی قسم کے لوگ تھے ایک دو مسافر اپنے لباس سے شہری لگ رہے تھے میں نے ان میں سے ایک مسافر سے اپنی شکستہ پسینی زبان میں پوچھا کہ پیچھے سے بس کب آئے گی؟ اس آدمی نے مجھے گھور کر ایک نظر دیکھا اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے دوسری طرف چلا گیا ڈرائیور اور کنڈکٹر دونوں بس کے بونٹ پر بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے اور دیہاتی مسافروں کے شور مچاتے سوالوں کا جواب دینے کی بجائے انہیں پانے ہاتھ سے جھڑک جھڑک کر پیچھے جانے کا اشارہ کر رہے تھے میں سڑک پر ٹہلتا ٹہلتا ذرا آگے جا کر ڈک کنارے ایک پتھر پر بیٹھ گیا مجھے ہر حالت میں دوسرے مسافروں کے ساتھ پیچھے آنے والی بس کا انتظار کرنا تھا اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا چاروں طرف کشادہ اور دور پہاڑیوں تک پھیلی ہوئی تھی میرے قریب ہی شہتوت کا ایک گنجان درخت کھڑا تھا شہتوت کے درخت کو میں دور ہی سے پہچان لیتا ہوں لاہور کے کئی باغوں اور پرانی آبادیوں میں شہتوت کے درخت لگے ہوئے ہیں بچپن میں ہم شہتوت کے درختوں پر چڑھ کر یا اس کی ٹہنیاں ہلا ہلا کر کچے پکے شہتوت کھایا کرتے تھے۔

کھیتوں میں سورج کی سنہری روشنی ماند پڑتی جارہی تھی میں سخت بوریت محسوس کررہا تھا بڑی بدمزگی پیدا ہوگئی تھی مجھے معلوم تھا کہ یہاں کم از کم دو گھنٹے ضرور بیٹھنا پڑے گا کیونکہ کولاش قصبے سے ہماری بس کے بعد اگلی بس کو دو گھنٹے بعد قرطبہ کی جانب روانہ ہونا تھا کچھ پتہ نہیں تھا کہ وہ بس دو کی بجائے تین گھنٹوں بعد چلے۔ اس کا بطلب تھا کہ ہمیں اس ویران علاقے میں رات پڑسکتی تھی میں نے سگریٹ سلگالیا اور صبر شکر کر کے بیٹھا رہا۔ جب بیٹھے بیٹھے تھک گیا تو تھیلا کمر کے ساتھ لٹکایا اور سڑک پر آگے کی جانب ٹہلتا ہوا دور نکل گیا یہاں ایک چھوٹی سی پتھر کی پلیا تھی جس کے نیچے سے چشمے کا پانی بہہ رہا تھا میں نے نیچے اتر کر منہ ہاتھ دھویا۔ پانی کے دو تین گھونٹ پیئے۔ پانی بڑا میٹھا تھا سوچنے لگا ہوسکتا ہے کبھی عرب مسلمانوں کا کوئی فوجی دستہ ادھر سے گذرا ہوا اور انہوں نے بھی یہاں گھوڑے روک کر پانی پیا ہوا اور وضو کر کے نماز ادا کی ہو۔ بلاشبہ اندلس کی سرزمین پر قدم قدم پر ہمیں مور اور عرب مسلمان سلاطین کے دور حکومت کی یادگاریں ملتی ہیں اور ان کی یاد دلاتی ہیں۔

پانی پی کر میں ٹشو پیپر سے منہ صاف کرتا دوبارہ سڑک پر چڑھ آا اور پلیا پر تھیلا قریب رکھ کر بیٹھ گیا میں نے گردن موڑ کر اپنی بے بس بس کی طرف دیکھا بس سڑک کے کنارے اسی حالت میں کڑھی تھی کچھ مسافر سڑک کنارے بیٹھے تھے کچھ سڑک سے نیچے اتر کر کھیتوں میں چل پھر رہے تھے اتنے میں مجھے ایک گاڑی آتی نظر آئی۔ غروب ہوتے سورج کی سنہری روشنی میں اس گاڑی کی چھت چمک رہی تھی مسافر اٹھ کھڑے ہوئے جو مسافر کھیتوں میں چل پھر رہے تھے بھاگ کر سڑک پر آگئے مگر وہ بس نہیں تھی بلکہ ایک ویگن تھی مسافروں نے اسے ہاتھ دے کر رکوانے کی کوشش کی مگر ویگن رکے بغیر آگے نکل گئی اب ویگن میری طرف آرہی تھی مسافر دور پیچھے کھڑے ہاتھ ہلا ہلا کر یقیناً ویگن ڈرائیور کو گالیاں دے رہے تھے میں نے بیٹھے بیٹھے

ویگن کو حسرت بھری نظروں سے دیکھا مجھے معلوم تھا کہ جو ویگن پیچھے اتنے مسافروں کو دیکھ کر نہیں رکی وہ میرے لیے یعنی مجھے لفٹ دینے کے لیے کہاں رکے گی مگر میرا خیال غلط نکلا۔ ویگن میرے قریب سے گذری تو چند قدم آگے جا کر رک گئی پھر ڈرائیور نے سر باہر نکال کر مجھے اپنی طرف بلایا میں نے تھیلا اٹھایا اور دوڑ کر ویگن کے پاس چلا گیا۔

ڈرائیور کوئی پڑھا لکھا آدمی لگ رہا تھا آنکھوں پر سفید فریم والی عینک تھی بالوں میں ہلکی ہلکی سفیدی آ رہی تھی عمر پچاس کے قریب ہوگی اس نے نسواری کوٹ کے اوپر سرخ رنگ کی بولگا رکھی تھی مجھ سے مسکرا کر سپینی میں پوچھا:

''ٹورسٹ ہو سینور؟''

میں نے فوراً گردن ہلا کر کہا:

''یس سینور! ٹورسٹ!''

اس نے کھڑکی کھول دی اور کہا:

''جلدی سے بیٹھ جاؤ دوسرے لوگ آ گئے تو مشکل بن جائے گی۔''

اس نے دروازہ کھلو دیا میں لپک کر ویگن میں سوار ہوا اور اس شریف آدمی کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا ویگن فوراً آگے چل پڑی یہ سب کچھ اتنی جلدی ہو گیا تھا کہ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں کہاں بے یار و مددگار ہو کر سڑک کنارے بیٹھا تھا اور کہاں اب ایک آرام دہ خالی ویگن میں ایک پڑھے لکھے شریف آدمی کے ساتھ بیٹھا اپنی منزل کی طرف رواں ہوں اس آدمی نے سپینی زبان میں مجھ سے پوچھا کہ میرا تعلق کس ملک سے ہے پھر خود ہی ہنس دیا اور انگریزی میں یہی سوال پوچھا میں نے انگریزی میں جواب دیا کہ میں پاکستان سے سپین کی سیر و سیاحت کرنے آیا ہوں۔ راستے میں بس خراب ہو گئی تھی اور میں پریشان بیٹھا تھا کہ تم نے مجھے لفٹ

دے دی۔ تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں اس آدمی کے چہرے پر بڑی مدبرانہ اور دانشورانہ مسکراہٹ تھی وہ ونڈ سکرین میں سے سامنے سڑک پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ کہنے لگا:

''پاکستان مسلم ملک ہے تم پاکستان کے کس شہر سے آئے ہو؟''

میں نے لاہور کا نام لیا تو وہ سر ہلاتے ہوئے خوش ہو کر بولا:

''لہو لہو میں انڈیا جاتے ہوئے لہو سے گذرا تھا تاریخی شہر ہے مجھے اچھا لگا تھا لوگ بڑے مہمان نواز ہیں.....''

پھر اس نے ڈیش بورڈ میں سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر میری طرف بڑھایا:

''اگر تم سگریٹ پیتے ہو تو اس میں سے ایک سگریٹ اپنے لیے نکال لو اور ایک مجھے سلگا کر دے دو۔''

یہ امریکی سگریٹ تھے میں نے تھینک یو کہہ کر ایک سگریٹ سلگا کر دیا اور یک خود لگا لیا اس آدمی نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا:

''میرا نام ہونرے فیریئر ہے میں قرطبہ کے ایک سکول میں ٹیچر ہوں وہاں لڑکے لڑکیوں کو تاریخ اور جغرافیہ پڑھاتا ہوں تم قرطبہ جا رہے ہو ناں کہ راستے میں کہیں ڈراپ ہو گے؟''

میں نے کہا: ''میں قرطبہ ہی جا رہا ہوں''

پھر میں نے اس سے پوچھا کہ اس نے دوسرے مسافروں کے لیے اپنی گاڑی کیوں کھڑی نہیں کی تھی۔

''میں دیکھ رہا تھا کہ مسافر تمہاری گاڑی رکوانے کے لیے سڑک کے درمیان آ گئے تھے مگر تمہاری گاڑی آگے نکل گئی اور پھر مجھے لفٹ دینے کا خیال تمہیں کیسے آ گیا؟''

ہوزے فریر ہنسنے لگا۔ بولا:

''میں نے کبھی ان پڑھ دیہاتی ہسپانویوں کو لفٹ نہیں دی یہ لوگ راستے میں بول بول کر کان کھا جاتے ہیں میں پڑھے لکھے لوگوں یا سیاحوں کو اکثر لفٹ دے دیا کرتا ہوں کولاش میں میری ایک کزن رہتی ہے ادھر ہفتے میں ایک بار میرا آنا ہوتا ہے ان لوگوں کی گاڑیاں اکثر خراب ہو جاتی ہیں۔''

سورج غروب ہو چکا تھا اور آس پاس وادی میں شام کے سائے گہرے ہونے لگے تھے میں نے اس شخص کے نام کا تلفظ ہوزے لکھا ہے سپین میں یا سپین سے باہر یورپ اور امریکہ میں رہنے والے ہسپانی جب اپنے نام سے پہلے J لکھتے ہیں تو اسے ایچ (H) کی آواز کے ساتھ بولتے ہیں مثلاً یہ شخص جب اپنا نام لکھے گا تو Joes یعنی جوزے لکھے گا مگر بولتے وقت وہ اپنا نام ہوزے بتائے گا جن لوگوں کو سپین یا یورپ اور امریکہ میں ہسپانوی لوگوں کے قریب رہنے کا موقع نہیں ملا وہ اکثر ان لوگوں کے نام اردو میں ہوزے کی بجائے جوزے یا جوزف ہی لکھتے ہیں میں یہ غلطی نہیں کروں گا کیونکہ میں نہ صرف سپین میں بلکہ یورپ اور خاص طور پر امریکہ میں ان لوگوں کے ساتھ کافی دیر وقت گذار چکا ہوں۔

یہ جان کر یہ آدمی یعنی مسٹر ہوزے فریئر تاریخ کا آدمی ہے میں نے اس سے اندلس کے تاریخی پس منظر کے بارے میں ذکر کرتے ہوئے کہا:

''یہاں مجھے عربوں اور مراکش کے مسلمانوں کی ثقافت کا نمایاں اثر نظر آتا ہے تمہارا کیا خیال ہے؟''

مسٹر ہوزے بدستور مسکرا رہا تھا۔ اس نے سگریٹ کا کش لگا۔ ویگن کی ونڈ سکرین پر نظریں جمائے ہوئے بولا:

''میں تعصب سے کام نہیں لوں گا اس ملک پر مسلمانوں نے آٹھ سو سال تک حکومت کی ہے ان کا اثر تو ضرور رہے گا۔''

میں نے اپنے اندر ایک فخر سا محسوس کیا میں نے سوال کیا:

''مجھے یہاں کی قدیم عمارتوں کی طرز تعمیر میں بھی مراکشی ثقافت کا اثر نمایاں لگتا ہے۔''

مسٹر ہوزے کہنے لگا:

''تم اچھی خاصی انگریزی بول لیتے ہو تم پڑھے لکھے نوجوان لگتے ہو تم مسلمان بھی ہو مگر مجھے حیرانی ہے کہ تم اپنی تاریخ سے ناواقف ہو اور کچھ نہیں تو تمہیں سپین کی تاریخ ضرور پڑھنی چاہیے تھی سپین پر مسلمانوں نے بہت دیر حکومت کی ہے اور نسلوں تک کے لیے اپنے اثرات چھوڑ گئے ہیں۔ سنو! میں تمہیں بتاتا ہوں آٹھویں صدی عیسوی میں عرب مسلمانوں کی ایک فوج فرانس کے اندر پائیرز کی وادیوں تک جا پہنچی اس کے بعد یہی عرب مسلمان شمالی افریقہ کے مسلمانوں کے ساتھ مل کر جبرالٹر کو فتح کرتے ہوئے سپین میں آگے بڑھے اور دیکھتے دیکھتے انہوں نے سارے سپین میں ایک ایسی سلطنت قائم کی جس کا شان و شکوہ پھر سپین کو نصیب نہ ہو سکا۔ عرب مسلمان آٹھ سو برس تک سپین پر حکومت کرتے رہے انہوں نے یہاں علم و حکمت تعمیرات اور فلسفہ و سائنس کے تاریک ایوانوں میں وہ چراغ روشن کئے کہ جن کی روشنی آج بھی یورپ کی درس گاہوں کی راہ نمائی کرتی ہے۔ تمہیں سپین میں ہر جگہ سڑکوں شہروں دیہات گاؤں تک کے نام عربی زبان میں ملیں گے مثلاً دادالکبیر الجزیرہ اور قلعہ ایوب وغیرہ..... تم مسجد قرطبہ تو ضرور دیکھنے جاؤ گے۔''

میں نے کہا:

''ضرور جاؤں گا اس کو دیکھنے کی تمنا تو میں اپنے دل میں لے کر نکلا ہوں۔''

ہوزے فریئر نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا:

''تو پھر تم مسجد قرطبہ کے احاطے میں ایک گرجا دیکھو گے اس کا نام LA MEZQUITA ہے یعنی مسجد۔''

ہوزے اسی طرح ہنس رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو ہم عیسائی لوگ کہاں تک عربوں سے پیچھا چھڑائیں گے اس نے آخر میں انتہائی بے باکی اور صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا:

''ہم اس حقیقت کو چاہیں بھی تو نہیں چھپا سکتے تو ہماری رگوں میں عرب مسلمانوں کا خون دوڑ رہا ہے اور ہمارے اندر حسن ذہانت اور بہادری کا جو جوہر ہے وہ ان عرب مسلمانوں کی بدولت ہے۔''

اس وقت گاڑی کے باہر رات کا اندھیرا چھا چکا تھا ہوزے نے دور پہاڑیوں کے درمیان ایک جگہ جھلملاتی روشنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

''وہ دیکھو یہ روشنی قرطبہ کی چیک پوسٹ کی ہے۔''

میں نے پوچھا:

''کیا وہاں قرطبہ شہر کا بارڈر ہے؟''

''نہیں ایسی بات نہیں ہے اصل میں ادھر غرناطہ سے شمالی افریقہ کے سمگلر منشیات لے کر قرطبہ میں داخل ہو جاتے تھے اب یہاں میونسپلٹی کی جانب سے ایک چیک پوسٹ قائم کی گئی ہے۔''

جیسے جیسے ویگن پہاڑیوں میں آگے بڑھ رہی تھی آس پاس فاصلے فاصلے پر روشنیاں جھلملاتی دکھائی دینے لگی تھیں۔ سڑک بھی کشادہ ہو گئی تھی ایک ٹیلے کو پار کر کے ہم وادی میں اترے تو سڑک کی دونوں جانب بجلی کے کھمبوں پر مرکری لائٹس روشن تھیں ہوزے کہنے لگا تھا:

''ہم قرطبہ ایڈمنسٹریشن کی حدود میں داخل ہو گئے ہیں۔''

ہم ایک دریا پر سے گذرے ہوزے نے کہا:

''یہ دریائے دادالکبیر ہے اس کا نام بھی عرب مسلمانوں نے آج سے سینکڑوں برس پہلے رکھا تھا اور آج تک اس کا یہی نام چلا آ رہا تھا۔ اسے تم ہم عیسائی لوگوں کی کشادہ دلی بھی کہہ سکتے ہو۔ لاؤ مجھے ایک سگریٹ سلگا دو۔''

ہوزے سفر کے دوران یہ چوتھا سگریٹ پی رہا تھا میں نے دو سگریٹ سلگائے۔ ایک اسے دے دیا اور ایک خود پینے لگا یہ میرا بھی چوتھا سگریٹ تھا۔

دریائے دادالکبیر کا پل نہایت شاندار تھا اور اس پر جگہ جگہ روشنی ہو رہی تھی پل کی دوسری جانب سے قرطبہ شہر کی جگمگاتی عمارتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا ہم ہائی وے پر سے گذرتے ہوئے شہر کی ایک بارونق سڑک پر آ گئے قرطبہ کا شہر اونچی نیچی چھوٹی بڑی پہاڑیوں میں گھرا ہوا ہے یہاں جگہ جگہ کشادہ میدان بھی ہیں اور ساتھ ساتھ ملی ہوئی پہاڑیوں میں گھرا ہوا ہے یہاں جگہ جگہ کشادہ میدان بھی ہیں اور ساتھ ساتھ ملی ہوئی پہاڑیاں بھی ہیں۔ ان پہاڑیوں کی ڈھلانوں پر بھی بلڈنگیں دفاتر اور فلیٹس بنے ہوئے تھے جو رات کے وقت بھی جگمگا رہے تھے۔ لگتا تھا آسمان سے ستاروں کے ہجوم نیچے زمین پر اتر آئے ہیں۔

قرطبہ کی سڑکوں پر ٹریفک بالکل یورپ کے شہروں جیسا تھا۔ سڑکوں کے درمیان اوپر کر کے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر نیلے رنگ کی بورڈ بھی یورپ اور امریکہ کے انداز میں لگے ہوئے تھے جو شہر کے مختلف علاقوں کو جاتی سڑکوں کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔

ہوزے نے مجھ سے پوچھا:

''ہم قرطبہ شہر آ گئے ہیں مجھے بتاؤ کہ تم کہاں اترو گے؟ کیا تم کسی ہوٹل میں ٹھہرو گے

؟میرا خیال ہے کہ کوئی ٹورسٹ قرطبہ کے کسی ہوٹل کا خرچ برداشت نہیں کرسکتا۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا:

"سر! میں بھی ایک غریب ٹورسٹ ہوں ہوٹل کا خرچہ تو میری برداشت سے بھی باہر ہے۔"

ہوزے بولا:

"تمہیں ایک بات ضرور بتا دینا چاہتا ہوں یہاں کے لوگوں میں عربوں ایسی گرم جوشی اور مہمان نوازی ضروری پائی جاتی ہے لیکن یہاں کے عیسائی لوگوں کی اکثریت مسلمانوں کو پسند نہیں کرتی۔ اوپر سے چاہے وہ اچھی طرح ملیں مگر دل سے تمہیں پسند نہیں کریں گے اس لیے میرا تمہیں مشورہ یہی ہے کہ تم پرانے قرطبہ کے عرب محلے میں چلے جاؤ۔ وہاں قدیم زمانے میں عرب مسلمان تاجر رہا کرتے ہیں۔ ان کی چھ سات حویلیاں آج بھی اپنی جگہ پر موجود ہیں۔ وہاں موریطانیہ مرکش اور مصر کے کچھ مسلمان مل کر رہتے ہیں انہوں نے یہ حویلیاں کرائے پر لے رکھی ہیں۔ تمہیں وہاں رہنے کو مفت جگہ مل سکتی ہے۔"

پھر اس نے ایک نظر میری طرف ڈالی اور اپنی دلکش مسکراہٹ کے ساتھ کہا:

"یہ بات یہاں تمہیں شاید ہی کوئی کرسچین بتائے۔ تمہیں میرا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔"

میں نے شکریہ ادا کیا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس دیا:

"شکریہ ادا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں میں نے تو اپنا فرض ادا کیا ہے آخری میری رگوں میں بھی عرب مسلمانوں کا خون دوڑ رہا ہے۔"

ہماری ویگن قرطبہ کی کھلی سڑکوں پر سے نکل کر اب شہر کے نشیبی علاقے یعنی ڈاؤن ٹاؤن میں داخل ہوگئی تھی دائیں بائیں دکانوں میں روشنیاں ہو رہی تھیں ہر قسم کی چیزیں لگی تھیں

شوکیسوں میں لکڑی کے مردانہ اور زنانہ ماڈل کھڑے تھے۔ ہسپانوی عورتیں موسم بہار کے پھولدار بھڑکتے لباس میں ملبوس فٹ پاتھوں پر ہنستی مسکراتی ایک دوسری سے باتیں کرتی چلی جا رہی تھیں۔ مردوں کا لباس زیادہ تر وہی جینز اور جیکٹ والا تھا جو آج کل یورپ امریکہ میں عام پہنا جاتا ہے صرف ادھیڑ عمر کے لوگ اور بوڑھے لوگ کوٹ پتلون میں دکھائی دے جاتے تھے۔

ہوزے نے ایک جگہ فٹ پاتھ کے ساتھ گاڑی روک لی۔ کہنے لگا:

''میں نے تمہیں اپنے بارے میں یہ نہیں بتایا کہ میں شادی شدہ نہیں ہوں۔ جس سکول میں پڑھاتا ہوں وہ پرائیویٹ سکول ہے یہاں سے وہ بلاک چھوڑ کر ایک پرانی بلڈنگ کے سنگل بیڈروم فلیٹ میں برسوں سے اکیلا رہتا ہوں۔ اب تم یہاں سے اتر کر بائیں طرف گلی میں جاؤ گے تو اس کے آخر میں ایک چھتہ آئے گا۔ وہاں تین چار پرانی حویلیاں ساتھ ساتھ بنی ہوئی ہیں وہیں تمہارے شمالی افریقی مسلمان بھائی ملیں گے۔''

میں نے ہوزے کا شکریہ ادا کر کے رخصت ہونے لگا تو اس نے مجھے اپنا کارڈ نکال کر دیا اور کہا:

''اگر قرطبہ میں کسی قسم کی کوئی پریشانی پیش آجائے تو اس پتے پر میرے پاس آجانا میں شام کے بعد اپنے فلیٹ پر ہی ہوتا ہوں۔''

یہ کہہ کر وہ مسکرا دیا اور اس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

میں فٹ پاتھ پر چند قدم آگے گیا تو ایک گلی بائیں طرف چلی گئی تھی میں اس میں داخل ہو گیا تنگ سی گلی تھی مکانوں کے لکڑی کے چھجے نیچے کو جھکے ہوئے تھے بیچ میں ایک نئی طرز کا فلیٹوں والا مکان بھی تھا جس کی ہر منزل پر گیلری تھی۔ آگے گلی بند تھی اور اس کا آخری حصہ چھتا ہوا تھا یعنی اوپر چھت پڑی تھی۔ یہاں تین پرانی حویلیاں تھیں گلی کی چھت سے بلب روشن

تھا۔حویلی کے دروازے لکڑی کے تھے دروازے کے باہر دونوں جانب بیٹھنے کے لیے پتھر کے چبوترے بنے تھے۔میں ایک حویلی کی طرف بڑھا کہ کسی کو بلا کر اس سے بات کروں۔حویلی کا دروازہ بند تھا اور لوہے کی دستک لٹک رہی تھی۔

میں نے آہستہ سے دستک بجائی۔اندر سے کسی نے جواب نہ دیا۔تیسری بار دستک دینے یا بجانے پر دروازہ کھلا۔ایک سیاہ فام باریش تنومند آدمی باہر نکل کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔اس نے اسپینی میں مجھ سے پوچھا:

''کس سے ملنا ہے سینور!''

میں نے السلام علیکم کہا۔اس نے وعلیکم السلام کہا۔میں نے کہا:

''میں پاکستان کا سیاح ہو۔کیا یہاں رات بسر کرنے کو جگہ مل جائے گی؟ میں مسلمان ہوں۔''

باریش تنومند آدمی مجھے گھور کر دیکھنے لگا۔پھر ہاتھ کے اشارے سے کہا:

''میرے پیچھے آؤ۔''

حویلی کے اندر سپین کی پرانی حویلیوں اور پرانے مکانوں کی طرح ایک چھوٹا صحن تھا جس کے درمیان میں گول فوارہ تھا۔فوارہ بند تھا آگے تین اطراف میں برآمدہ تھا۔برآمدے میں دو تین کمرے بنے ہوئے تھے ہر کمرے کے باہر بجلی کا بلب جل رہا تھا باریش آدمی مجھے ایک کمرے میں لے گیا۔اندر فرش پر قالین بچھا ہوا تھا تین سانولی رنگ والے آدمی سفید لمبے لمبے کرتے پہنے قالین پر بیٹھے آپس میں ایک دوسرے کی طرف جھک کر باتیں کر رہے تھے مجھے دیکھ کر وہ چپ ہو گئے۔انہوں نے باریش آدمی سے جو مجھے لے کر وہاں آیا تھا عربی میں کچھ پوچھا باریش آدمی نے عربی میں ہی کچھ جواب دیا تینوں آدمی مجھے تکنے لگے۔باریش آدمی قالین

پران کے پاس بیٹھ گیا اور عربی میں ایک جملہ کہا جس میں پاکستان کا لفظ بھی آیا تھا۔اس پر وہ تینوں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ان میں سے ایک نے مجھے اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا۔میں تھیلا ایک طرف رکھ کر قالین پر ان لوگوں کے پاس بیٹھ گیا۔باریش آدمی نے انہیں بتایا تھا کہ میں پسینی زبان میں بات چیت کر لیتا ہوں۔اس پر اس آدمی نے مجھ سے مصافحہ کیا اور پسینی زبان میں بولا:

''الباکستان ہمارا مسلم برادر ملک ہے تم سے مل کر ہم سب کو خوشی ہوئی۔تم یہاں کتنے دن رہنا چاہتے ہو؟''

میں نے کہا:

''میں.....میں قرطبہ شہر اور مسجد قرطبہ دیکھنا چاہتا ہوں۔''

ایک دوسرے آدمی نے کہا:

''ہاں ہاں.....مگر کتنے دن یہاں قیام کرنے کا ارادہ ہے؟''

میں یقینی طور پر انہیں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا اتنا میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ لوگ زیادہ دن شاید مجھے اپنے ہاں نہ رکھ سکیں۔میں نے یونہی کہہ دیا:

''دو تین دن رہنے کا خیال ہے۔''

میری بات سن کر وہ چاروں آدمی ایک دوسرے کے ساتھ عربی میں باتیں کرنے لگے میں عربی نہیں سمجھتا تھا لہٰذا خاموش بیٹھا نہیں دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ دیکھیں وہ کیا فیصلہ کرتے ہیں انہوں نے تنومند باریش آدمی کو کچھ سمجھایا۔

باریش آدمی میری طرف متوجہ ہو کر پسینی میں بولا:

''سینور! ہم تمہیں صرف دو راتیں یہاں ٹھہرا سکیں گے کیونکہ دو دن بعد ہمارے کچھ

مہمان بارسلونا سے ہمارے یہاں رہنے کے لیے آرہے ہیں۔"

میں نے غنیمت جانا۔ میں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا: "بڑی مہربانی ہوگی میں دو دن کے بعد کوئی اور جگہ تلاش کرلوں گا۔"

اس پر وہ چاروں یوں خوش ہوئے جیسے ان پر سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہو۔ انہوں نے اسی کمرہ میں قالین کے ایک کونے کی طرف اشارہ کر کے کہا:

"تم رات کو یہاں سونا۔ کھانا کھایا ہے کہ نہیں؟"

میں نے پوچھا:

"یہاں کوئی سستا سا ہوٹل ہو تو بتا دیں میں وہاں جا کر کھانا کھالوں گا۔"

اس پر وہ عربی میں نہ جانے کیا بولے اور پھر ایک نے اٹھ کر دوسری بار مجھ سے مصافحہ کیا اور بڑی شفقت سے کہا:

"الباکستان.....الباکستان"

باریش آدمی بولا:

"تم کھانا ہمارے ساتھ کھاؤ گے۔ تم ہمارے برادر مسلمان ملک باکستان کے مسلم بھائی ہو۔"

وہیں قالین پر سفید چادر بچھ گئی۔ باریش آدمی باہر گیا اور کہیں سے کھانا لے آیا جو ہم سب نے مل کر کھایا۔ اس کے بعد تلخ مراکشی قہوہ آ گیا۔ میرے لیے چادر اور تکیہ قالین کے کونے مین دیوار کے ساتھ لگا دیا گیا۔

باریش تم وہاں سو جاؤ۔"

میں پریشان سا ہو گیا۔ میں اتنی جلدی نہیں سونا چاہتا تھا۔ پہلی بار قرطبہ کے تاریخی شہر

میں آیا تھا۔ خیال تھا کہ رات کے وقت قرطبہ شہر کی روشن سڑکوں پر سیر کروں گا۔ کسی ریستوران میں بیٹھ کر کافی پیوں گا۔ مگر ان لوگوں نے جیسے مجھے حکم دیا تھا کہ اب میں سو جاؤں میں نے کھسیانی سی ہنسی کے ساتھ کہا:

''میں ذرا باہر کچھ دیر سیر کرنا چاہتا ہوں۔''

چاروں آدمیوں نے ایک بار پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور عربی زبان میں تیز تیز جملوں کا تبادلہ کیا پھر باریش آدمی میری طرف متوجہ ہو کر بولا:

''نہیں سینور! یہاں رات کو سیاحوں کو لوٹ لیا جاتا ہے تم باہر نہیں جاؤ گے بس آرام سے جا کر سو جاؤ صبح سیر کر لینا۔''

مجھے کچھ خوف سا محسوس ہونے لگا کہ کہیں میں جرائم پیشہ لوگوں میں تو نہیں آ گیا مگر شکل صورت سے وہ لوگ جرائم پیشہ نہیں لگتے تھے۔ میں نے سوچا کہ یہ لوگ ذرا سخت مزاج ہیں اور پھر اگر یہ رات کو مجھے باہر نہیں جانے دے رہے تو میری بھلائی کے لیے ہی ایسا کر رہے ہیں۔

میں تھیلا اٹھا کر قالین پر بچھی ہوئی چادر پر جا کر بیٹھ گیا میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا کہ باتھ روم کہاں ہے؟ ایک بار پھر چاروں آدمی یوں چونک کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ جیسے میں نے کوئی ایسی بات کہہ دی ہو جو مجھے نہیں کہنی چاہیے تھی باریش آدمی نے کوٹھڑی کے کونے کی طرف اشارہ کیا میں اٹھ کر ادھر گیا وہاں ایک چھوٹا دروازہ تھا جو بند تھا۔ اسے کھلا تو دیکھا کہ یہی باتھ روم ہے میں نے صابن سے ہاتھ منہ دھویا برش سے دانت صاف کئے اور واپس اپنے بستر پر آ کر بیٹھ گیا۔ باریش آدمی اور اس کے تینوں ساتھی مجھے مسلسل تک رہے تھے۔ پھر ان میں سے ایک نے کہا:

''سو جاؤ۔''

میں چپکے سے لیٹ گیا۔

پھر وہ چاروں آدمی اٹھے۔ایک نے بتی بجھادی اور سارے سارے کوٹھڑی سے باہر چلے گئے۔انہوں نے دروازہ بند کر دیا۔کوٹھڑی میں گھپ اندھیرا ہو گیا۔پہلے تو میری طبیعت سخت گھبرائی کہ یہ میں کہاں آ کر قید ہو گیا ہوں لیکن میرے سامنے دوسرا کوئی راستہ نہیؒ تھا۔آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگا۔آنکھوں میں لاہور شہر کی تصویریں پھیرنے لگیں۔گھر یاد آیا گھر والے یاد آئے دوست یاد آنے لگے اپنے گھر کا وہ کمرہ یاد آیا جہاں میرا بستر لگا ہوتا ہے۔سرہانے کی طرف ٹیبل لیمپ ہوتا ہے۔جب چاہا ٹیبل لیمپ بجھا کر سو جاتا تھا۔اگر دل چاہتا تو دوبارہ ٹیبل لیمپ جلا لیتا تھا۔میرا دل چاہا کہ اٹھ کر کمرے کی بتی جلا دوں۔پھر ان پراسرار آدمیوں کے چہرے آنکھوں کے سامنے آ گئے۔مجھے یقین تھا کہ جیسے ہی ماں نے بتی جلائی وہ کسی نہ کسی جگہ سے فوراً نکل آئیں گے اور مجھے پوچھیں گے کہ بتی تم نے کیوں جلائی؟ سو جاؤ۔

اور واقعی کچھ دیر بعد میں سو گیا۔

دوسرے روز ابھی دن چڑھا ہی تھا کہ میں پرانی حویلی سے نکل آیا میرا پروگرام مسجد قرطبہ دیکھنے کا تھا۔میرے میزبان وہاں نہیں تھے میں نے پاسپورٹ وغیرہ اپنی جیب میں رکھ لیے تھے تھیلا کمرے میں ہی رہنے دیا آتی دفعہ کمرہ بند کر کے دروازے پر باہر سے کنڈی لگا دی تھی۔

میں قرطبہ شہر کے ڈاؤن ٹاؤن میں تھا۔عرب محلے کی گلی سے نکل کر مین بازار میں آ گیا چائے وغیرہ کی دکانیں کھلی ہوئی تھیں ایک جگہ میں نے ناشتہ کیا۔اس سے مسجد قرطبہ کے بارے میں پوچھا کہ میں وہاں جانا چاہتا ہوں۔مجھے بتایا گیا کہ اگلے چوک سے مجھے E-17 نمبر کی

بس ملے گی جو قرطبہ کیتھیڈرل کو جاتی ہے پھر اس آدمی نے مجھے ہدایت کی۔

''مجھے قرطبہ کو یہاں کوئی نہیں جانتا۔ باوہ کیتھیڈرل ہے تم قرطبہ کا برا گرجا گھر پوچھ لینا۔''

میرے دل پر ایک چوٹ سی لگی۔ آہ! مسلمانوں کی سلطنت کو زوال آ گیا ان کو اندلس کی سرزمین سے ایک ایک کر کے نکال دیا گیا ان کی مسجدیں گرجاؤں میں تبدیل ہو گئیں۔ میں چوک سے بس میں سوار ہو گیا بس قرطبہ شہر کی مختلف سڑکوں پر سے گذرتی ہوئی اس پہڑی وادی میں داخل ہو گئی تھی جہاں مسجد قرطبہ واقع تھی۔ سورج پہاڑیوں کے اوپر آ گیا تھا۔ ساری وادی اور وادی کی سڑکوں پر دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ بس دریائے دادالکبیر کے پل پر سے گذرنے لگی مجھے علامہ اقبالؒ کا وہ شعر یاد آ گیا جو انہوں نے اسی دریا کے کنارے کھڑے ہو کر کہا تھا.....

آب رواں کبیر تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب

میں سوچنے لگا وہ اور زمانہ کونسا تھا جس کا خواب علامہ اقبالؒ نے دیکھا تھا یقیناً یہ برصغیر میں ایک نئی اسلامی مملکت پاکستان کا خواب تھا۔ جہاں مسلمان قرآن کے دکھائے ہوئے راستے پر چل کر اندلس میں مسلمانوں کے چھوڑے ہوئے سفر کو پورا کریں گے۔ میں انہی خیالات میں کھویا ہوا تھا کہ بس مسجد قرطبہ کے قریب پہنچ چکی تھی۔ دادالکبیر یا اوادی الکبیر کا یہ پل ماڈرن قرطبہ کے شہر کو پرانے عرب قرطبہ سے منسلک بھی کرتا ہے اور جدا بھی۔

مجھے ایک طرف وادی میں کچھ فاصلے پر دریا کے دونوں کناروں پر کسی پرانے پل کے کھنڈر بنے ستون نظر آئے۔ یہ دریا کا قدیم پل تھا جو مسلمانوں نے اپنے دور حکومت میں تعمیر کیا تھا۔ اب اس پل کے کھنڈر ہی باقی رہ گئے تھے دریائے دادالکبیر کے پل پر سے گذرنے کے بعد

مسجد قرطبہ سے ملحقہ علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہاں جگہ جگہ پہاڑیوں کی ڈھلانوں اور چھوٹے چھوٹے میدانی قطعوں پر بے شمار مکان اور فلیٹوں والی اونچی اونچی بلڈنگیں نظر آ رہی تھیں۔ لیکن ان میں کوئی ہائی رائیز بلڈنگ نہیں تھی جیسا کہ ماڈرن قرطبہ کے شہر میں نظر آ جاتی ہیں۔ اس آبادی کے درمیان میں عظیم الشان مسجد قرطبہ کے گنبد اور مینار نظر آئے تو میرا سر خود بخود خدا کے حضور جھک گیا صدیوں سے یہ تاریخی مسد اپنی جگہ پر قائم و دائم تھی۔ بس مسجد کے بڑے گیٹ سے کچھ فاصلے پر آ کر رک گئی۔ دوسرے سیاحوں کے ساتھ میں بھی بس سے اتر کر بڑے پھاٹک کی طرف چلنے لگا۔ مسجد کا وسیع و عریض احاطہ تھا جس کا بیرونی صدر دروازہ تھا آگے ایک پھل دار باغ تھا۔ باغ میں گھاس کا ایک پلاٹ تھا جہاں پہلے کچھ سیاح بیٹھے تھے۔ میں بھی ان کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ ان میں ایک مشرقی رنگ والا سیاح بھی تھا۔ میں نے اس سے انگریزی میں پوچھا:

''یہ لوگ یہاں کیوں بیٹھے ہیں؟''

اس نے مجھے غور سے دیکھا اور کہا:

''کیا تم انڈیا سے آئے ہو؟''

میں نے کہا:

''نہیں میں پاکستان سے آیا ہوں مسلمان ہوں۔''

اس آدمی نے دونوں ہاتھ بڑھا کر مجھ سے مصافحہ کیا اور بولا:

''میں بھی مسلمان ہوں۔ میں یمن کا رہنے والا ہوں۔ ہم لوگ مسجد کا دروازہ کھلنے کا انتظار کر رہے ہیں۔''

میں نے اپنے اردگرد بیٹھے ہوئے سیاحوں پر نگاہ ڈالی۔ ان میں بیشتر یورپ کے ملکوں کے سیاح تھے عورتیں بھی تھیں یہ لوگ بیئر کے ڈبے پی رہے تھے میں ان ڈبوں کو پہچانتا تھا میرا

دل تاریخ کے سنگ دلانہ فیصلوں پر ملول سا ہو گیا۔ یہ وقت بھی آنا تھا کہ جب مسجد قرطبہ کے باہر بیٹھ کر غیر مسلموں نے ساغر و مینا کے جام لنڈھانے تھے۔ مجھے قرآن پاک کی وہ تنبیہ یاد آ گئی:

فا اعتربروا یا اولی الابصار

''مسلمانو! اس سے عبرت پکڑو۔''

مسجد قرطبہ کا اندرونی دروازہ کوئی دو گھنٹے بعد کھلا وہیں سے اندر جانے کے لیے ٹکٹ لینا پڑتا تھا میں نے بھی ٹکٹ لیا اور مسجد کے برآمدے میں داخل ہو گیا برآمدے کی دیواریں اور ستون خستہ حالت میں تھے۔

قرطبہ کی مسجد کو وہاں مسجد کلیسا یعنی MISQUITA CAHEDRAL کے نام سے پکارا جاتا ہے مسجد کے اندرونی صحن میں داخل ہوں تو دائیں ہاتھ کو ایک مینار کا دروازہ ملتا ہے سیاح اس مینار پر چڑھ کر دریا اور پرانے قرطبہ شہر کے مکانوں کا منظر دیکھتے ہیں۔ دو ہسپانوی لڑکیاں اس مینار کے دروازے پر کھڑی تھیں جب میں اپنے یمن کے مسلمان ساتھی سیاح کے ساتھ مینار کی سیڑھیاں چڑھنے لگا تو محافظ ہسپانوی لڑکی نے انگریزی میں ہمیں ہدایت کی کہ مینار کے اوپر جا کر گھنٹیاں نہ بجانا۔ اس مینار کے اوپر بھی گرجا گھروں کی طرح گھنٹیاں لگی ہیں جو خاص خاص وقت پر بجائی جاتی ہیں مینار کے اوپر سے دریائے دادالکبیر اور پرانے قرطبہ شہر کے سفید سفید مکانوں کا منظر بے حد دلکش تھا۔

مسجد قرطبہ کے کتنے ہی دروازے ہیں میں انہیں گن نہیں سکا۔

سیاحوں کے لیے دن میں صرف ایک دروازہ کھولا جاتا ہے یہاں بھی مجھے مسجد میں داخل ہونے کے لیے ٹکٹ لینا پڑا۔ یہ سپین کی رنسی میں ڈیڑھ سو پیسٹا کا تھا جو پاکستان کرنسی میں تقریباً ایک روپیہ بنتا تھا۔ میرے سامنے مسجد قرطبہ کا وسیع و عریض ہال تھا جس کے اتنے ستون تھے کہ

انہیں شمار کرنا چاہتا بھی تو شمار نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے بے اختیار حضرت علامہ اقبالؒ کی نظر مسجد قرطبہ کے اشعار یاد آنے لگے:

تیرا جلال و جمال مرد خدا کی دلیل
وہ بھی جلیل و جمیل تو بھی جلیل و جمیل

تیری بنا پائیدار تیرے ستوں سے شمار
تیرے درو بام پر وادی امین کا نور

تیرا منار بلند جلوہ گر جبرئیل

ان ستونوں کے درمیان کئی محراب دار راستے تھے۔ مسجد کی دیواروں پر عیسائی راہب مردوں اور عورتوں کے مجسمے لگے تھے۔ ان کے گرد لوہے کے جنگلے لگا دیئے گئے تھے۔ مسجد کا فرش جو کبھی قیمتی سنگ مرمر کا ہوا کرتا تھا اب وہاں پختہ اینٹیں لگی ہوئی تھیں فرش کی ایک جانب زمین کے برابر قبریں بنی ہوئی تھیں یہ قبریں عیسائی بزرگوں کی تھیں قبروں کے اوپر ان کے نام بھی لکھے ہوئے تھے ایک جگہ ستونوں کے درمیان حضرت مریمؑ کے مجسمے کے پاؤں میں موم بتیاں روشن تھیں۔

میں بھی دوسرے سیاحوں کے ساتھ مسجد کے ہال میں آگے بڑھتا ہوا وہاں پہنچ گیا جہاں مسجد کے عین درمیان میں گرجا گھر کی قربان گاہ بنی ہوئی تھی اس قربان گاہ پر عیسائی سیاح موم بتیاں روشن کر کے رکھ رہے تھے میں آگے نکل گیا اب میرے سامنے مسجد قرطبہ کا محراب تھا۔ محراب کے اوپر پیشانی پر قرآنی آیات درج تھیں اور بیل بوٹے بنے ہوئے تھے مسجد کی انتظامیہ کی جانب سے کسی مسلمان کو یہاں نماز پڑھنے کی عام اجازت نہیں تھی لیکن اگر مسلمان کسی ستون کے پاس کھڑے ہو کر دو نفل پڑھ لے تو اسے کچھ نہیں کہا جاتا تھا۔ مگر اس عمل کو وہاں

پسند نہیں کیا جاتا تھا۔ میں نے اپنے یمنی مسلمان ساتھی سے کہا:

''میں پاکستان سے یہ عزم کر کے چلا تھا کہ مسجد قرطبہ میں دو نفل ضرور ادا کروں گا کیا تم میرا ساتھ دو گے؟''

وہ کہنے لگا:

''میں خود یہی نیت باندھ کر یہاں آیا ہوں میں تو وضو کر کے یہاں داخل ہوا ہوں۔''

میں نے وضو نہیں کیا تھا۔ یمنی دوست کو وہیں بٹھا کر میں وضو کے لیے پانی کی تلاش میں ایک راہ داری سے دوسری جانب چلا گیا اللہ کی رضا میرے ساتھ تھی ایک جگہ پانی کا بڑا سا ٹینک بنا ہوا تھا اس کے ساتھ ٹوٹیاں بھی لگی ہوئی تھیں میں نے وہیں جلدی جلدی وضو کیا اور مسجد میں آ گیا۔

اس کے بعد میں اپنے یمنی ساتھی کے ہمراہ محراب کے سامنے ایک ستون کے پاس آ گیا اور ہم دونوں نے نفل پڑھنے شروع کر دیئے خدا گواہ ہے میں کبھی عید بقرعید پر ہی نماز پڑھتا ہوں نماز پڑھنی تو مجھے آتی ہے مگر نماز میں کیا پڑھا جاتا ہے یہ مجھے بالکل نہیں معلوم میں مسجد قرطبہ کے محراب کے سامنے خدا کے حضور سجدہ ریزہ ہوا تو مجھ پر ایک ہیبت سی طاری ہو گئی مجھے کچھ یاد نہیں کہ میں نے کتنے نفل پڑھے کب نفل ختم کیے جب میں نے سلام پھیرا تو دیکھا کہ کچھ فاصلے پر مسجد کے دو تین محافظ کچھ عیسائی سیاح مجھے تعجب اور ناپسندیدگی سے دیکھ رہے تھے کچھ لوگوں نے ہماری تصویریں بھی بنائیں ہم اٹھ کر دوسرے ستوں کی طرف چل دیئے۔ کافی دیر تک ہم مسجد کے ہال میں رہے پھر باہر آ گئے۔

مسجد کے صدر دروازے کے سامنے ایک چھوٹا سا عجائب گھر ہے جس میں قرطبہ کے تاریخی نوادرات رکھے ہوئے ہیں ہم دونوں سیاح یعنی میں اور میرا یمنی دوست مسجد کی ایک

جانب چھوٹے سے پلاٹ کے گھاس پر بیٹھ گئے میرے یمنی دوست نے کہا،

''اس ملک میں اب کوئی مسجد نہیں ہے ہزاروں مسجدیں مسلمانوں کے زوال کے بعد عیسائیوں نے ڈھادی تھیں کچھ مسجدوں کو گرجا گھروں میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔''

پھر اس نے بتایا کہ جنرل فرانکو کے زمانے میں اس کی فوج میں مراکش کے مسلمان سپاہی بھی تھے۔ان کے لیے جنرل نے ایک چھوٹی سی مسجد بنانے کی اجازت دے دی تھی مگر اب وہ مسجد بھی ویران پڑی ہے اور کسی سیاح مسلمان کو اس کے اندر جانے کی اجازت نہیں ہے۔یمنی مسلمان سیاح کہنے لگا:

''تیرھویں صدی عیسوی میں جب سپین میں مسلمانوں کے اقتدار کا سورج غروب ہو گیا تو سوائے اس مسجد کے عیسائیوں نے مسلمانوں کے قریباً تمام آثار مٹا ڈالے۔اس وقت عیسائی بادشاہ کارلوس پنجم کی سپین پر حکومت تھی۔پادریوں نے اس سے اجازت لے کر مسجد قرطبہ کو بھی گرجا گھر میں بدل ڈالا۔تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ تین چار سال بعد جب عیسائی بادشاہ اس گرجے جو دیکھنے آیا تو مسجد قرطبہ کے عظیم الشان ستونوں محرابوں اور اس کے جاہ و جلال کو دیکھ کر اس کی زبان سے بے اختیار یہ کلمات نکلے.....صد افسوس! جس چیز کو تم نے مسجد کے اندر بنایا ہے وہ اس کے باہر بھی بن سکتی تھی۔مگر جس مسجد کو تم نے بگاڑ دیا ہے وہ شاید پھر کبھی تعمیر نہ ہو سکے۔''

عیسائی بادشاہ کی زبان سے سچ کا اظہار ہو گیا تھا۔علامہ اقبالؒ کی نظک کے اشعار بے اختیار میری زبان سے جاری ہو گئے:

اے حرم قرطبہ! عشق سے تیرا وجود
عشق سراپا دوام جس میں نہیں وفت وبود

رنگ ہو یا خشت و سنگ چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزہ حق کی ہے خون جگر سے نمود
قطرہ خون جگر سل کو بناتا ہے دل
خون جگر سے صدا سوز و سرور و سرود
تجھ سے حرم مرتبت اندلسیوں کی سر زمیں
ہے تہہ گردوں اگر حسن میں تیری نظیر
قلب مسلماں میں ہے اور نہیں ہے کہیں

شام کے وقت میں واپس اپنی قیام گاہ پر آ گیا۔

میرے پراسرار میزبان مجھ سے سخت ناراض ہوئے کہ میں صبح جاتے ہوئے کمرہ کھلا کیوں چھوڑا گیا تھا میں بڑا شرمسار ہوا۔ میں نے کہا:

''مجھ سے غلطی ہوگئی۔ دراصل آپ لوگوں میں سے یہاں کوئی بھی نہیں تھا۔''

باریش تنومند آدمی نے کہا،

''چلو اندر چلو۔ ہم کھانا کھانے لگے ہیں۔''

میں کوٹھڑی میں آ گیا۔ وہ لوگ میرے آگے آگے اندر گئے۔ قالین پر دسترخوان لگا تھا اور کھانے کی تھالیاں سجی ہوئی تھیں۔ خدا جانے یہ کھانا کون لگا گیا تھا۔ کیونکہ میں نے وہاں کسی ملازم کو نہیں دیکھا تھا اور میرے چاروں میزبان بھی میرے پیچھے ہی حویلی کے دروازے پر آئے تھے۔ اس وقت ان لوگوں پر مجھے افراسیاب کے جادوگر شاگردوں کا گمان ہوا جن کو جنات آ کر کھانا دے جاتے تھے۔ کھانے کے دوران چاروں پراسرار میزبان خاموش رہے۔ کسی نے ذرا بھی ایک دوسرے سے بات نہ کی۔ جب کھانا کھا چکے تو باریش آدمی باہر چلا گیا۔ واپس آیا تو

اس نے طشت اتار رکھا تھا جس میں قہوہ کے پانچ چھوٹی پیالیاں رکھی ہوئی تھیں۔قہوہ بھی خاموشی سے پیا گیا۔

مجھے محسوس ہوا کہ میں کسی خاموش فلم کا کردار ہوں۔قہوہ پی چکنے کے بعد باریش آدمی نے اپنے تین ساتھیوں کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔پھر انہوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے کچھ کہا۔بارش آدمی میری طرف متوجہ ہو کر بولا:

''اب تم سو جاؤ۔کل صبح ہمارے مہمان آ رہے ہیں۔صبح صبح میں تمہیں جگا دوں گا۔تم چلے جانا اور کسی دوسری جگہ اپنے ٹھہرنے کا بندوبست کر لینا۔''

اس کے ساتھ ہی چاروں آدمی ایک دوسرے کے پیچھے باہر نکل گئے اور دروازہ انہوں نے بند کر دیا۔میں بڑا خوش تھا کہ ان میں سے بجلی کا بلب کسی نے نہیں بجھایا تھا۔لیکن میری یہ خوشی بڑی عارضی ثابت ہوئی۔دوسرے لمحے باریش آدمی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا اور بجلی کا بٹن دبا کر بتی بجھا دی۔

کوٹھڑی میں گھپ اندھیرا چھا گیا۔

میں سوچنے لگا کہ کل صبح کہاں جاؤں گا۔یہ لوگ بڑے مہمان نواز تھے۔مگر ان کی بھی مجبوری تھی۔اگر ان کے مہمان نہ آ رہے ہوتے تو یہ مجھے مزید چند روز ٹھہرنے کی ضرور اجازت دے دیتے لے دے کے سکول ٹیچر اور دانشور عیسائی بزرگ ہوزے فرپیئر ہی ایک ایسا شخص رہ گیا تھا جو میری مدد کر سکتا تھا اور اس نے رخصت ہوتے ہوئے کہا بھی تھا کہ اگر یہاں کسی قسم کی پریشانی پیش آئے تو میرے پاس چلے آنا۔

کسی نہ کسی طرح میں نے رات کاٹی۔منہ اندھیرے میری آنکھ کھل گئی۔میں نے گھڑی دیکھی۔ابھی پچھلی رات کے یا اصبح کے سوا چار ہی بجے تھے میں نے دوبارہ سونے کی

کوشش کی مگر ای خیال سے نیند نہیں آ رہی تھی کہ میرے پراسرار میزبان کسی بھی وقت مجھے وہاں سے بے دخل کرنے کے لیے وارد ہو سکتے ہیں مجھ پر فرض تھا کہ میں ان کا انتظار کرتا اور جاتے وقت ان کی میزبانی کا شکریہ ادا کرتا لیکن جانے کیا بات تھی کہ میرا دل وہاں ایک منٹ رکنے کو تیار نہ تھا۔ میں اٹھا باتھ روم میں جا کر منہ ہاتھ دھویا۔ دانت صاف کئے تھیلے میں اپنی چیزیں رکھیں اسے کمر پر باندھنے کی بجائے کاندھے پر لٹکایا اور کمرے سے نکل گیا۔

یہ قرطبہ کا ڈاؤن ٹاؤن کا علاقہ تھا۔ کافی گنجان آباد تھا۔ اگرچہ ابھی رات باقی تھی مگر سڑکوں پر روشنیاں ہو رہی تھیں۔ اکا دکا گاڑی بھی گذر جاتی تھی اکثر مکانوں کی بتیاں جل رہی تھیں۔ سٹور بند تھے میں فٹ پاتھ پر کچھ دور تک ٹہلتا ہوا نکل گیا میں اس طرف گیا تھا جدھر سکول ٹیچر ہوزے نے بتایا تھا کہ یہاں سے دو فرلانگ چھوڑ کر ایک بلڈنگ ہے جس کی دوسری منزل کے فلیٹ میں رہتا ہوں۔

میں نے جیب سے مسٹر ہوزے کا کارڈ نکالا اور بجلی کے کھمبے کے نیچے آ کر اسے غور سے دیکھنے لگا کارڈ پر بلڈنگ کا نام لکھا ہوا تھا۔ بڑا مشکل نام تھا لاطینی نام لگتا تھا میں دو بلاک آگے نکل گیا بائیں جانب دیکھا تو واں ایک تنگ مگر پختہ فرش والی گلی تھی۔ گلی میں آمنے سامنے فلیٹس بنے ہوئے تھے۔ کسی کسی فلیٹ کے باہر روشنی ہو رہی تھی میں بلڈنگوں کے نام پڑھنے لگا۔ ایک جگہ وہی نام لکھا تھا جو ہوزے فریئر کے کارڈ پر درج تھا۔

یہ معمولی قسم کے خستہ حال فلیٹس تھے۔ دروازوں کے باہر ٹریش کین رکھے تھے جو کوڑے کرکٹ سے بھرے ہوئے تھے کوڑے کرکٹ سے بھرے ہوئے سیاہ بڑے لفافے بھی ایک طرف پڑے تھے۔

میں نے سوچا کہ اس وقت مسٹر ہوزے سو رہا ہو گا جب دن کافی نکل آئے گا تب اس

کے پاس جاؤں گا چنانچہ میں گلی میں سے واپس ہو گیا یونہی شتر بے مہار کی طرح قرطبہ کے اس گنجان آبادی والے علاقے کے بازار میں پھرنے لگا۔ ایک جگہ چوک میں فوارہ لگا ہوا تھا۔ اس کے اردگرد سنگ سرخ کا چبوترا بنا ہوا تھا۔ میں وہاں بیٹھ گیا میرے دیکھتے ہی دیکھتے سڑیٹ لائٹس بجھ گئیں اور آسمان پر صبح کا نور پھیلتا نظر آنے لگا۔ آہستہ آہستہ صبح کا نور دن کے اجالے میں تبدیل ہوتا گیا۔ سڑک پر ٹریفک شروع ہو گئی دکانوں کے شٹر اٹھائے جانے لگے۔ یہ فیشن ایبل علاقہ نہیں تھا۔ گنجان بازاروں میں دکانیں اور سٹور ساتھ ساتھ بنے ہوئے تھے قریب ہی کسی گرجا گھر سے صبح کی گھنٹیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ کبھی اس وقت یہاں صبح کے نور کے ساتھ ہی بلکہ اس سے بھی ذرا پہلے مسجدوں سے اذانوں کی آوازیں آیا کرتی تھیں۔ اب وہ آوازیں خاموش ہو گئی ہیں۔

ایک ہسپانوی نوجوان ریسنگ سائیکل پر سوار جھک کر سائیکل چلاتا میرے قریب سے گذر گیا۔ اس نے سائیکل کے ساتھ ٹرانسسٹر لٹکا رکھا تھا۔ ٹرانسسٹر میں سے تیز ہسپانوی میوزک کی لہریں بلند ہو رہی تھیں۔ اردگرد کے فلیٹوں کی روشنیاں بھی بجھا دی گئی تھیں۔ دنکی چہل پہل شروع ہو گئی تھی پانی سے بھرا ہوا ایک ٹینک مجھ سے تھوڑے فاصلے پر آ کر رک گیا۔ اس میں سے دو آدمی نکلے اور پائپ سڑک پر ڈال کر سڑک کو دھونے لگے۔ پانی فٹ پاتھ کے پہلوؤں سے لگی ہوئی جالیوں میں سے نکل کر نیچے گٹر میں جا رہا تھا۔ میں فوارے کے چبوترے سے اترا اور چوک کے سامنے والے بازار کے فٹ پاتھ پر آ گیا۔ ایک چھوٹے سے ریستوران میں کچھ مزدور اور محنت کش قسم کے ہسپانوی بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے۔ ان کو گرم گرم کافی پیتے دیکھ کر میری بھی بھوک چمک اٹھی۔ ریستوران میں داخل ہوا اور پتھر کی میز کے پاس بیٹھ گیا۔ ریستوران کی فضا میں کافی اور سینکی ہوئی ڈبل روٹی کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی میں نے مختصر ناشتہ کیا اور چائے کے

لیے کہا یہاں مجھے چائے مل گئی ورنہ یورپ میں سوائے برطانیہ اور ہالینڈ کے چائے کم ہی نظر آتی ہے لوگ عام طور پر کافی پیتے ہیں۔

ریستوران سے اس وقت نکلا جب دن کے ساڑھے چھ بج رہے تھے گرمیوں کے موسم میں اس وقت تک مشرقی یورپ کے ملکو میں کافی دن نکل آیا ہوتا ہے اب میں اپنے دانشور دوست اور تاریخ کے استاد ہوزے فریئر کے فلیٹ کی طرف روانہ ہو گیا جگہ میں دیکھ چکا تھا میں نے دوسری منزل میں اس کے فلیٹ کے دروازے پر آہستہ سے گھنٹی کا بٹن دبایا۔ مجھے گھنٹی کی دبی دبی آواز سنائی دی ہوزے فریئر نے ہی دروازہ کھولا وہ سلیپنگ گاؤن میں تھا۔ ایک ہاتھ میں اخبار اور دوسرے ہاتھ میں سیاہ کافی کی پیالی تھی۔ مجھے دیکھا تو اس کے چہرے پر وہی دلکش مسکراہٹ آ گئی جو ویلکن میں مجھے لفٹ دینے کے بعد سارا رستہ اس کے چہرے پر رہی تھی میں نے گڈ مارننگ مسٹر ہوزے کہا تو اس نے ایک طرف ہٹتے ہوئے کہا:

''پلیز سینور! کم ان گڈ مارننگ''

چھوٹا سا کمرہ تھا جہاں کپڑے اور کتابیں ادھر ادھر بکھری پڑی تھیں۔ ہوزے نے کافی میز پر رکھتے ہوئے کرسی پر سے اپنی پتلون کو اٹھا کر صوفے پر پھینکا اور پوچھا:

''ناشتہ کرو گے؟''

میں نے کہا:

''میں ناشتہ کر کے آیا ہوں۔''

''مگر کافی کی ایک پیالی ضرور ہونی چاہیے۔''

اور وہ تنگ سے کچن میں چلا گیا میرے سامنے اس نے چولہے پر سے کیتلی اٹھا کر پیلے میں کالی سیاہ کافی ڈالی۔ پھر اس میں دودھ ڈالنے سے پہلے مجھ سے پوچھا:

''دودھ والی کافی پیتے ہو سینور!''

میں نے کہا: ''یس!''

کافی پیتے ہوئے میں نے اپنے پراسرار مہمانوں والی ساری روداد سنا دی۔ ٹیچر ہوزے بہت ہنسا پھر شانے سکیڑ کر بولا:

''سینور! یہاں تم جتنے دن چاہے رہ سکتے ہو مگر تمہیں اسی صوفے پر سونا پڑے گا میرے پاس ایک ہی بیڈ روم ہے میں رات کو پلنگ پر لیٹ کر پڑھنے کا عادی ہوں۔''

میں نے خوش ہو کر کہا:

''سر! میں تو یہاں رات کو زمین پر سو جایا کروں گا۔''

''یہ تمہاری مرضی ہے۔ میں ابھی ایک گھنٹے تک سکول پڑھانے چلا جاؤں گا۔ ایک چابی تمہیں دے جاؤں گا۔ اگر تم میرے پیچھے میرا سامان لے جانا چاہو تو پلیز میری کتابیں نہ لے جانا۔ باقی چاہے سارا سامان لے جانا۔''

اور وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

جب وہ مجھے چابی دے کر چلا گیا تو میں نے دیکھا کہ ہوزے فریئر کے فلیٹ میں سوائے کتابوں کے اور کوئی قابل ذکر شے نہیں تھی۔ اپنے سارے سفر میں میں ایک کام کے بارے میں بڑا محتاط تھا مجھے دوران سفر جہاں کہیں موقع ملتا تھا میں وہاں اپنے کپڑے ضرور دھو لیا کرتا تھا یہاں بھی فلیٹ اور باتھ روم خالی دیکھ کر میں نے جلدی سے اپنی پتلون اتاری اور باتھ روم میں جا کر اسے سنک میں دھونا شروع کر دیا ایک دھلی ہوئی پتلون پہلے سے میرے تھیلے میں پڑی تھی گرم چیک قمیص بھی میں نے اپنے خانہ بدوشوں کے ساتھ قیام کے دوران دھو کر رکھ لی تھی پتلون دھو کر میں نے گیلری میں سکھانے کے لیے ڈال دی رومال بھی دھوئے اور باہر ڈل

دیئے۔ قینچی سے ناخن تراشے بال کٹوانے میں نے چھوڑ دیئے تھے اور وہ میری گردن تک بڑھ آئے تھے۔ یہ ویسے بھی مجھے اچھے لگتے تھے۔ اپنے جوگرشوز کو گیلے کپڑے سے خوب صاف کیا جرابیں دھوئیں پھر خوب صابن مل مل کر نہایا۔

دھوپ خوب نکلی ہوئی تھی میں نئی پتلون نئی قمیص پہن کر چھوٹے سے کمرے میں صوفے پر بیٹھ گیا اور ٹیلی ویژن آن کر کے مختلف پروگرام دیکھنے لگا۔ بی بی سی خبریں سنا رہا تھا کہیں ڈانس کا پروگرام ہو رہا تھا کہیں بحث کا پروگرام ہو رہا تھا کہیں میوزک لگا ہوا تھا۔ اتنے میں دوپہر کا وقت ہو گیا میں نے کچن میں خود ہی ٹماٹر کے سینڈوچز بنا کر کھائے پھر کافی کی پیالی لے کر ٹی وی کے سامنے بیٹھ گیا اور ایک ڈاکومنٹری دیکھنے لگا۔

وہیں ٹی وی دیکھتے ہی دیکھتے مجھے نیند آ گئی۔ جب جاگا تو باہر گیلری میں سے دھوپ غائب ہو چکی تھی ٹائم دیکھا سہ پہر کے پونے چار بج رہے تھے گیلری پر پڑی ہوئی میری پتلون سوکھ گئی تھی رومال انڈویئر اور جرابیں بھی سوکھ گئیں تھیں۔ میں نے انہیں استری کیا اور تھیلے میں تہہ کر کے رکھ دیا۔ اتنے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے ریسیور اٹھا کر کان کے ساتھ لگایا اور ہیلو کہا۔ دوسری طرف ہوزے فریئر کی آواز آئی:

''ہیلو! میرا خیال تھا تم سیر سپاٹے کو نکل گئے ہو گے۔''

میں نے ہنس کر کہا: ''نہیں میں نہانے دھونے میں لگا رہا۔''

''بڑی اچھی بات ہے میں نے اس لیے فون کیا تھا کہ میں آج رات ذرا دیر سے آؤں گا ایک جگہ ڈنر ہے وہاں جانا پڑ گیا ہے کچن میں سب کچھ موجود ہے جو چاہے بنا کر کھا لینا او کے۔''

میں نے اس نیک دل مہمان نواز سکول ٹیچر کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ریسیور رکھ

دیا۔تھوڑی دیر میں شام پڑ گئی۔میں نے سوچا کہ مسٹر ہوزے تو دیر سے آئیں گے تب تک میں اکیلا کمرے میں بیٹھا کیا کروں گا۔کیوں نہ شہر کا سیر سپاٹا کیا جائے۔یہ سوچ کر میں نے اپنے پاسپورٹ کے کاغذات پتلون کی جیب سے نکال کر تھیلے میں رکھ دیئے۔کیونکہ یہاں میرے کاغذات محفوظ تھے۔اس کے بعد دروازے کو لاک کر کے چابی وہیں زیتون کے پودے والے گملے کے نیچے رکھی اور باہر چوک میں آ کر ایک طرف چل پڑا۔میں چابی ساتھ نہیں لے جانا چاہتا تھا اور گملے کے نیچے چابی بڑی محفوظ پڑی رہتی اور کسی کا اس طرف دھیان بھی نہیں جا سکتا تھا۔یہ طریقہ میں نے اٹلی میں ایک فلم دیکھتے ہوئے سیکھا تھا۔

گنجان آبادی سے نکل کر میں ایک نسبتاً کشادہ بازار میں آ گیا۔فٹ پاتھ پر خوب رونق تھی بجلی کے قمقمے روشن ہو گئے تھے۔قرطبہ کا ماڈرن عاقہ ذرا آگے جا کر شروع ہو رہا تھا میں ایک سٹریٹ کے قریب سے گذرا تو میرے کانوں میں آرگن بجنے کی آواز آئی۔میں نے رک کر گلی کی طرف دیکھا۔آواز اسی گلی میں سے کسی جگہ سے آ رہی تھی آرگن کی موسیقی ایسی دردناک اور اداس تھی کہ اس نے میرے دل پر بڑا اثر کیا اور میں گلی میں چل پڑا۔یہ گلی ہمارے شہر لاہور کی گلیوں جیسی نہیں تھی بلکہ اسلام آباد کی طرح کہہ سکتے ہیں نہایت پکی کشادہ گلی تھی۔اتنی چوڑی تھی جتنی ہمارے لاہور کی بیڈن روڈ ہے گلی میں آدمی کوئی چلتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ایک جگہ لال بتی جل رہی تھی قریب گیا تو دیکھا وہاں تانبے کی ایک پلیٹ لگی تھی جس پر سپینش زبان میں لکھے ہوئے الفاظ ابھرے ہوئے تھے یہ گرجے کا نام تھا۔اس کا ترجمہ تھا،

''دو بہنوں کی خانقاہ۔''

یہ کوئی چھوٹا سا گرجا تھا۔آرگن کی آواز اسی چرچ میں سے آ رہی تھی آرگن کے لمبے لمبے اداس سروں کا مجھ پر کچھ ایسا اثر تھا کہ میں چوچ کے اندر چلا آیا یہ چھوٹا سا چوچ تھا دونوں جانب بنچوں کی چھ سات قطاریں لگی تھیں ان بنچوں پر کوئی شخص نظر نہ آیا۔قربان گاہ پر حضرت عیسیٰؑ کی صلیب والی تصویر لگی تھی ایک طرف مریم بی بیؑ کا مجسمہ تھا۔ان کے قدموں کے پاس لمبی لمبی موم

بتیاں جل رہی تھیں۔

کونے میں ایک پادری صاحب آرگن کے سامنے بیٹھے آرگن بجا رہے تھے اسی آرگن کی آواز مجھے کھینچ کر یہاں یہاں لے آئی ننھی ماحول میں اس قدر تقدس تھا کہ میں بڑے ادب سے ایک بنچ پر بیٹھ گیا قربان گاہ کے پاس ایک سیاہ چادر والی عورت گھٹنوں کے بل جھکی ہوئی تھی وہ عبادت میں مصروف تھی۔ عبادت کرنے کے بعد اس عورت نے جھک کر قربان گاہ پر کسی چیز کو بوسہ دیا اور واپس مڑی۔ بنچوں کے درمیان میں سے گذرتی ہوئی جب وہ میرے قریب سے گذری تو میں نے احراما آنکھیں جھکالیں۔ عورت میرے قریب سے گذر گئی آرگن کی آواز بھی بند ہوگئی۔

میں خاموشی سے اٹھا اور چرچ کے دروازے کی طرف بڑھا ابھی میں دروازے سے دو چار قدم دور ہی تھا کہ مجھے باہر کسی عورت کی چیخ کی آواز سنائی دی وہ پسینی زبان میں مدد کے لیے پکار رہی تھی میں دوڑ کر باہر گلی میں آیا تو دیکھا ایک غنڈہ اسی چرچ والی سیاہ پوش عورت کے ہاتھ سے پرس چھیننے کی کوشش کر رہا تھا پرس غنڈے کے ہاتھ میں تھا اس کی ڈوڑی عورت کے ہاتھوں میں تھی اتنے میں غنڈے نے جیب سے چاقو نکال لیا عورت نے ڈر کر پرس کی ڈوری ہاتھ سے چھوڑ دی اس وقت نہ جانے میرے اندر کہاں سے اتنا حوصلہ اور بہادری آگئی کہ میں نے غنڈے پر چھلانگ لگادی وہ دبلا پتلا سا تھا وہ نیچے گرا اس کے ہاتھ سے چاقو چھوٹ گیا۔ میرے اچانک اوپر گرنے سے وہ گھبرا بھی گیا تھا۔ میں نے پوری قوت سے ان کی گردن پر مکا مارا اور لپک کر گلی کے فرش پر گرا ہوا چاقو اٹھالیا اور پرس غنڈے کے ہاتھ سے چھین لیا۔ غنڈا گھبرا کر ایک طرف بھاگ گیا۔ سیاہ پوش عورت خوف سے کانپتی ہوئی ایک طرف کھڑی یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ میں نے ایک پیشہ ور غنڈے کو بھگا دیا ہے۔

میں پرس لے کر عورت کے قریب آیا۔ وہاں چوچ کے باہر لگی سرخ روشنی میں عورت کو دیکھا تو مجھے ایسے لگا جیسے میرے سامنے کوئی حور کھڑی ہے میں اس کے حسن کی تعریف میں اور کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بلکہ میں اس کے حسن کی تعریف کر ہی نہیں سکتا تھا یا شاید میں نے اس سے پہلے اتنی حسین عورت نہیں دیکھی تھی۔ اس نے پرس لے لیا اور سپینش میں میرا شکریہ ادا کرنے لگی میں نے اپنی جیکٹ کی کہنیوں کو ہاتھ سے جھاڑتے ہوئے سپینش میں ہی کہا:

''تمہاری مدد کرنا میرا فرض تھا سینوریتا۔''

وہ ذرا مسکرائی:

''تم مجھے غیر ملکی لگتے ہو۔''

میں نے کہا:

''میں پاکستان سے آیا ہوں ٹورسٹ ہوں آگرن کی آواز سنی تو چوچ میں چلا آیا تھا۔''

عورت نے میرے ساتھ میرے گھر تک چلو میرے ماں باپ تم سے مل کر بڑے خوش ہوں گے۔''

میں اوپر اوپر سے انکار کرنے لگا مگر دل سے یہی چاہتا تھا کہ اس حسن کی دیوی کے گھر ضرور جاؤں میں نے کہا:

''اگر تمہاری یہی خواہش ہے تو میں چلے چلتا ہوں۔''

اس کی گاڑی ذرا آگے جا کر گلی کی نکڑ پر کھڑی تھی کہنے لگی:

''یہ علاقہ ٹھیک نہیں ہے اندھیرا ہو جانے کے بعد یہاں اکثر غنڈے لوگوں کو لوٹ لیتے ہیں مگر آج مقدس دن تھا اور مجھے دو بہنوں کی خانقاہ پر عبادت کرنے ضرور آنا تھا۔ اگر عین وقت پر تم نہ آ جاتے تو وہ میں بدمعاش میرا پرس چھین کر لے گیا تھا میں تمہارا شکریہ ادا کرتی ہوں۔''

اس حسین اور پاکیزہ بے داغ گلاب کے سفید پھول ایسے چہرے والی عورت نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ گاڑی بڑے امیر گھرانوں والی تھی لگتا تھا اس عورت کا تعلق بھی قرطبہ کے کسی امیر کبیر گھرانے سے ہے میں گاڑی میں بیٹھ گیا اس نے اپنے پرس میں سے سفید ریشمی دستانے نکال کر پہنے اور گاڑی سٹارٹ کر کے اسے تیزی سے گلی میں سے نکال کر سڑک پر لے آئی۔

''میرا نام دونا فرانسسکہ میں ڈان رمولس کی اکلوتی بیٹی ہوں تمہارا نام کیا ہے سینور۔''

میں نے اسے اپنا نام بتایا وہ کہنے لگی:

''ہمارے خاندان کا شجرہ نسب شاہ کستیہ ڈان روگر میز کے خاندان سے جا ملتا ہے تمہارے لیے یہ نام اجنبی ہوں گے مگر ہمیں ان پر فخر ہے ہمارے پاس بڑی زمینیں اور باغات تھے مگر میرے دادا نے سب کچھ اپنی عیاشیوں کی نذر کر دیا۔ اب صرف کچھ باغات اور ولا رہ گیا ہے جہاں میں اپنے بوڑھے باپ کے ساتھ رہتی ہوں میری ماں مر چکی ہے میں اسی کی روح کو ثواب پہنچانے ہر اتوار کے دن اس چرچ میں عبادت کرنے آتی ہوں۔''

اس پری چہرہ خاتون نے مجھے اپنے خاندان کے پورے پس منظر سے آگاہ کر دیا تھا میرے لیے اس کے خاندان اور اس کی اعلیٰ نسبتی میں کوئی کشش نہیں تھی میں تو صرف اس پاکیزہ صفت حور ایسے چہرے والی خاتون کے حسن بے مثال کا گرویدہ تھا خدا جانے وہ کن سی قوت تھی جو اس خاتون کے حسن بلا خیز کو دیکھتے ہی مجھے اس کے قریب لے آئی تھی اب میں سوچتا ہوں کہ غنڈہ عین موقع پر آ کر اس خاتون کا پرس چھیننے کی کوشش نہ کرتا اور میں اسے مار کر بھگا نہ دیتا تو شاید مجھے خاتون سے بات کرنے کا بھی موقع نہ ملتا اور اس کی ساری زندگی مجھے حسرت رہتی۔

زندگی میں کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اچانک نظر آ جانے والا کوئی چہرہ اس لمحے کے

لیے دیکھی ہوئی شکل ساری زندگی کا سرمایہ بن کر رہ جاتی ہے میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے تاریخ کے کسی دور میں اس حسین خاتون سے مل کر جدا ہو چکا ہوں میں نے اسے پہچان لیا تھا مگر اس نے مجھے نہیں پہچانا تھا میں دوسرے جنم کا قائم نہیں ہوں مگر اس خاتون کا چہرہ اس کی باتیں مجھے یقین دلا رہی تھیں کہ ہم پہلے بھی کسی جگہ مل چکے ہیں اور ایک دوسرے سے محبت کرتے رہے ہیں میں اپنے دل کے حقیقی جذبات کو یہاں قلمبند کر رہا ہوں میں کوئی نیک پاکباز اور پارسا آدمی نہیں ہوں زندگی میں بڑے گناہ کر چکا ہوں جن میں خدا سے ہمیشہ معافی مانگتا رہتا ہوں لیکن میں اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہوں کہ مجھ پر سب سے زیادہ اثر درختوں پھولوں سرسبز وادیوں پہاڑی چشموں اور جنگلوں کے پراسرار مناظر اور حسین عورتوں کا ہوتا ہے۔اور یہ ہسپانوی دوشیزہ جو میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھی تھی اور جس نے اپنا نام دونا فرانسسکا بتایا تھا اس پر تو مجھے اپنی بچھڑی ہوئی محبت کا گمان ہو رہا تھا۔

اس خاتون کا ولا قرطبہ شہر سے باہر ایک پرفضا کھلی جگہ پر واقع تھا خوب صورت سبزہ زار میں گھرا ہوا ایک پرانا دو منزلہ بنگلہ تھا جس کے ستونوں اور اونچی اونچی منقش چھتوں سے قرون وسطی کی قدامت نمایات تھی۔

دونا فراسسکا نے مجھے اپنے باپ سے ملایا اور سارا واقعہ سنا دیا۔دونا کا بوڑھا باپ منہ میں پائپ لگائے ڈرائنگ روم کی گوتھک طرز کی کھڑکی کے پاس آرام کرسی سے کرسی پر بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا وہ اٹھ کر مجھے ملا اور میرا شکریہ ادا کرنے لگا کہ میں نے اس کی اکلوتی بیٹی کو غنڈوں سے بچایا تھا۔

دونا کو میں نے ڈرائنگ روم میں جلتے فانوس کی روشنی میں یدکھا تو اس کے حسن دلآویز نے مجھ پر طلسم سا طاری کر دیا اس نے اپنے باپ سے کہا:

''پاپا! ہم انہیں کھانا کھائے بغیر یہاں سے نہیں جانے دیں گے۔''

بوڑھے ڈان رمولس نے کتاب ایک طرف رکھ دی تھی اور پائپ میں انگوٹھے سے تمباکو دبا رہا تھا میری طرف دیکھ کر بڑی شائستگی سے مسکراتے ہوئے بولا:

''یہ آج رات ہمارے مہمان ہوں گے۔''

دونا دوسرے کمرے کی طرف چلی گئی۔ بوڑھا ڈان رولس مجھ سے باتیں کرنے لگا میں اتنی زیادہ سپینش زبان ابھی نہیں جانتا تھا۔ اس نے میری سہولت کے لیے انگریزی میں گفتگو شروع کر دی۔ اتنے میں ایک وردی پوش ملازم ٹرے میں سکاچ کی ایک بوتل اور دو گلاس رکھ کر لے آیا۔

''کیا تم سکاچ پسند کرو گے؟''

''تمہارے لیے وائن آجائے گی ہمارے ہاں سپین اور فرانس کی وائن کے علاوہ کیلے فورنیا کی وائن بھی ہے کیلے فورنیا میں بڑی اچھی وائن تیار ہونے لگی ہے۔''

میں نے ڈان رمولس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا:

''میں اس وقت صرف کافی پیوں گا۔''

ڈان رمولس نے ملازم کو میرے لیے کافی لانے کو کہا اور خود گلاس میں تھوڑی سی سکاچ ڈال کر اسے ایک ہی گھونٹ میں حل قمیں انڈیل کر پائپ سلگاتے ہوئے بولا:

''تمہارا ملک پاکستان ایک اسلامی ملک ہے تم مسلمان ہوں مجھے مسلمانوں سے مل کر ہمیشہ خوشی ہوتی ہے۔ اگر چہ ایک عرصے تک ہمارے ملک پر حکومت کرتے رہے ہیں وہ ہمارے آباؤ اجداد کے حاکم تھے۔ مگر اس کے باوجود ان میں بعض خوبیاں بھی تھیں۔ کوئی ان خوبیوں سے انکار نہیں کر سکتا۔''

میں ہوں ہاں کر کے اس گفتگو میں شامل رہا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس موضوع پر بات کرے مگر میں نے سپین میں تقریباً ہر پڑھے لکھے آدمی کو دیکھا ہے کہ اس جب اس ے کسی دوسرے ملک خاص طور پر اسلامی ملک کا کوئی مسلمان ملتا ہے تو وہ اپنے ملک اور اپنے آباؤ اجداد پر مسلمانوں کی طویل مدت تک حکمرانی کی بات ضرور چھیڑ دیتا ہے اور اس کا طرز کلام طنزیہ ہو جاتا ہے وہ عرب مسلمانوں کی تعریف بھی کرتا ہے لیکن ساتھ ساتھ انپر تنقید بھی ضرور کر جاتا ہے اس کی وجہ محض یہی تعصب ہے کہ عرب مسلمان باہر سے آئے تھے اور آٹھ سو سال تک ان کے ملک پر حکومت کرتے رہے پری چہرہ خاتون دونا فرانسسکا کا بوڑھا باپ ڈان رمولس بھی اسی مرض میں مبتلا تھا۔ اس مرض میں مبتلا ہونا تو بہت ضروری تھا کیونکہ وہ اپنا سلسلہ نسب عیسائی بادشاہوں سے ملاتا تھا۔

حقیقت یہ تھی کہ مجھے اس کی بیٹی کا حسن سحر خیز وہاں کھینچتا ہوا لے آیا تھا اور میں زیادہ وقت اس کی بیٹی فرانسسکا کے ساتھ گذارنا چاہتا تھا بوڑھا ڈان پائپ کا دھواں اڑاتے ہوئے اپنی دھن میں مجھ سے باتیں کئے جا رہا تھا اور میں ڈرائنگ روم کا جائزہ بھی لے رہا تھا۔ دیواروں پر تین جگہوں پر پرانی ڈھالیں اور تلواریں لٹکی ہوئی تھیں فرنیچر پرانا اور فرسودہ تھا صاف معلوم ہو رہا تھا کہ صاحب خانہ عہد ماضی کی یادوں کے سہارے زندہ ہے اور زبوں حالی کا شکار ہے صوفے کا کپڑا جگہ جگہ سے میلا ہو رہا تھا۔

بنگلے میں داخل ہوتے ہوئے میں نے لان کی گھاس بڑھی ہوئی اور فالتو جھاڑ جھنکاڑ بھی اگا ہوا دیکھا تھا جس سے اندازہ لگایا تھا کہ صاحب خانہ دو چار پرانے باغوں کی آمدنی پر ہی گذارہ کر رہا ہے۔

اتنے میں دونا بلانکا کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے بڑا خوب صورت موسم بہار کا

شام کا لباس پہن لیا تھا بالوں میں ایک طرف ہسپانوی دوشیزاؤں کی روائت کے مطابق سرخ گلاس کا پھول بھی لگا تھا۔ اس کے حسن نے نہ صرف کمرے کی فضا میں بلکہ میرے دل میں بھی اک آگ سی لگا دی۔ میں جیسے اس کے حسن کے طلسم کے اثر میں تھا اس کی خوبصورتی نے مجھ پر جادو سا کر دیا تھا میں اسے دیکھتے ہی رہ گیا مجھے یہ بھی خبر نہ ہوئی کہ اس دوران ملازم میرے سامنے تپائی پر کافی کی پیالی رکھ گیا ہے۔

دونا فراسسکا نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھ کر کہا:

''سینور! تمہارا کافی ٹھنڈی ہو رہی ہے۔''

جیسے طلسم اچانک ٹوٹ گیا میں نے چونک کر معذرت کی اور پیالی اٹھا کر ہونٹوں سے لگائی۔ دونا میرے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی کہنے لگی:

''سینور! میں نے خاص طور پر قرطبہ کے دریا کی مچھلی منگوائی ہے ہمارا خانساماں یہ مچھلی بڑی اچھی پکاتا ہے کیا تمہیں مچھلی پسند ہے؟''

میں نے اپنی خود فراموشی پر قابو پاتے ہوئے کہا:

''ہاں مجھے پسند ہے۔''

دونا مسکرا رہی تھی اس کی مسکراہٹ ایسی تھی جیسے سفید بادلوں میں ہلکی ہلکی بجلیاں چمک رہی ہوں اگرچہ ایسا کبھی ہوتا نہیں ہے مگر میں اس ہسپانوی دوشیزہ کے چہرے پر ایسا ہوتا دیکھ رہا تھا بوڑھے ڈان نے دوسرا پیگ چڑھاتے ہوئے اپنی بیٹی سے کہا:

''مہمان کو اپنی پینٹنگز دکھاؤ۔ اسے یقیناً تمہاری تصویریں دیکھ کر خوشی ہوگی۔''

دونا فرانسسکا صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی:

''سینور! شاید تمہیں میری تصویریں پسند نہ آئیں میں ابھی طالب علم ہوں پھر بھی میں

چاہوں گی کہ تم میری بنائی ہوئی تصویریں ضرور دیکھو۔"

اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور مجھے دوسرے کمرے میں لے گئی۔ اس کا نرم و نازک ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں مجسم چاندنی کا ہاتھ تھام رکھا ہے دوسرے کمرے کی دیواروں پر چھوٹے بڑے سائم کے چوکھٹوں میں دونا فرانسسکا کی پینٹ کی ہوئی روغنی اور آبی رنگوں کی تصویریں سجی ہوئی تھیں جس طرح ہمارے لاہور کے الحمرا کے ہال میں کوئی مصور اپنی نمائش کرنے کے لیے سجاتا ہے وہ مجھے ساتھ لے کر تصویریں دکھنے لگی۔ یہ لینڈ سکیپ بھی تھیں عورتوں اور بوڑھے آدمیوں کے پورٹریٹ بھی بنے ہوئے تھے۔ دیہاتی گھر جا گھروں کی تصویریں بھی تھیں وہ مجھے خاص طور پر ایک بڑے سائز کی تصویر کے پاس لے گئی اس تصویر میں ایک عیسائی بادشاہ تخت پر بیٹھا تھا اس کے پیچھے دو پادری سنے کی صلیبیں لیے کھڑے تھے ایک عیسائی فوجی جرنیل بھی موجود تھا جس کے سینے پر لگی زرہ پر صلیب کا نشان بنا ہوا تھا کرسچن لباس میں درباری اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھے تھے عیسائی بادشاہ کے سامنے ایک عربی لباس والا باریش شخص ذرا جھک کر اپنی تلوار بادشاہ کے قدموں میں رکھ رہا تھا۔

دونا فرانسسکا میرے پہلو میں کھڑی تھی کہنے لگی،

"اس تصویر میں میں نے غرناطہ کے آخری مسلمان حکمران کو عیسائی بادشاہ کے آگے ہتھیار ڈالتے دیکھایا ہے شاید تم اسے پسند نہ کرو مگر یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جس کو میں نے پینٹ کیا ہے۔"

میرے اندر ایک عجیب سی ہل چل پیدا ہوئی مجھے ایسے لگا جیسے میرے اندر سے کوئی شے بگولا بن کر اٹھی ہے اور زور زور سے چکر لگاتی دماغ کی طرف بڑھ رہی ہے۔

میں وہاں سے آگے بڑھ گیا میرے کانوں میں مجھے ابھی تک بگولے کی شاں شاں

سنائی دے رہی تھی اور میرا حلق کڑوا ہو گیا تھا دونا فرانسسکا شاید میری ذہنی اور نفسیاتی کیفیت کو سمجھ گئی تھی اس نے اس تصویر کے بارے میں دوبارہ کوئی بات نہ کی اور دوسری تصویر کے بارے میں بتانے لگی۔ میرے اندر جو بگولا چکراتا ہوا میرے دماغ کی طرف دوڑا تھا وہ اس تصویر سے ہٹ جانے کے بعد رک گیا تھا مگر اس کی گونج میرے کانوں میں ابھی تک سنائی دے رہی تھی اس تصویر میں غرناطہ کے آخری مسلمان تاجدار بی عبداللہ کو فاتح عیسائی بادشاہ کے سامنے سرنڈر کرتے دکھایا گیا تھا دونا فرانسسکا دوسری تصویر کے بارے میں مجھے جو کچھ بتا رہی تھی وہ میں کچھ نہیں سمجھ رہا تھا مجھے صرف اس کی آواز سنائی دے رہی تھی میں نے تصویر پر سے نظریں ہٹا لیں اور کمرے کی کھڑکی کے پاس آ گیا۔

کھڑکی کا پردہ ہٹا ہوا تھا اور باہر کا منظر نظر آ رہا تھا جہاں ایک چبوترے پر کوئی مجسمہ لگا ہوا تھا یہ مجسمہ بجلی کی روشنی میں مجھے دھندلا دھندلا نظر آنے لگا دونا آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی میرے قریب آ کر باہر کا منظر دیکھتے ہوئے بولی:

''سینور! یہ ہمارے جدامجد ڈان کارلوس کا مجسمہ ہے اسے آج سے تین سو سال پہلے سپین کے سب سے مشہور سنگ تراش ڈی موریر نے بنایا تھا۔''

میں نے سگریٹ جیب سے نکالا اور اپنے ماتھے پر ہاتھ پھیر کر کہا:

''سینوریتا فرانسسکا! میں اپنا لائٹر تمہارے پاپا کے کمرے میں بھول آیا ہوں کیوں نہ ہم کچھ دیر وہیں چل کر بیٹھیں!''

''ضرور ضرور سینور!''

ہم ساتھ والے کمرے میں آ گئے جہاں دونا کا باپ ڈان رمولس سکاچ کی آدھی بوتل ختم کرنے کے بعد اپنی گود میں رکھی ہوئی کتاب پر جھکا ہوا بے حس و حرکت پڑا تھا وہ تیز تیز قدم

اٹھاتی اپنے باپ کے پاس گئی۔

''پاپا! تم نے پھر وہی حرکت کی اوہ پاپا۔''

بوڑھے کو کچھ ہوش نہیں تھا۔ اس نے ملازم کو آواز دی۔ بوڑھے کے گھٹنے پر پڑی کتاب کو اٹھا کر میز پر رکھا اور میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی:

''پاپا کبھی کبھی زیادہ پی جاتے ہیں پھر میں انہیں ان کے بیڈروم میں پہنچا دیتی ہوں۔''

اتنے میں ملازم آ گیا اس نے بوڑھے ڈان رمولس کو اٹھایا اور اسے کچھ گھسیٹتا کچھ چلاتا ہوا کمرے سے لے گیا۔

دونا میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی اور سپین کے موسم کے بارے میں باتیں کرنا شروع کر دیں۔ پھر بولی،

''تمہارے ملک پاکستان میں کیسا موسم ہوتا ہے؟''

میں نے اسے بتایا کہ ہمارے ملک پاکستان میں ایک نہیں چار موسم ہوتے ہیں سردی گرمی برسات اور بہار کا موسم میز پر میرا لائٹر پڑا تھا میں نے سگریٹ سلگا لیا اور کہا:

''پاکستان میں قدرت نے ہر موسم سے ہمیں نوازا ہے ہر موسم کے پھل اور سبزیاں الگ ہوتی ہیں۔''

دونا کہنے لگی:

''میں نے پاکستان نہیں دیکھا لیکن مجھے بڑا شوق ہے کہ میں پاکستان جاؤں اور تمہارے ملک کے سارے موسم دیکھوں۔''

تھوڑی دیر تک ہم باتیں کرتے رہے عجیب بات ہے کہ جب سے میں نے اس خاتون کی بنائی ہوئی غرناطہ کی آخری تاجدار کی ہتھیار ڈالنے والی تصویر دیکھی تھی اس کا حسن میری

نگاہوں میں دھندلا پڑ گیا تھا اتنے میں اسی ملازم نے آ کر بتایا کہ کھانا لگ گیا ہے، ہم کھانے کے کمرے میں آ گئے۔ میز پر تین لمبی موم بتیاں روشن تھیں پلیٹیں بجلی کی روشنی میں چمک رہی تھیں۔

چینی کے قابوں میں بھنی ہوئی مچھلی کا شوربہ تھا پہلے ہلکے مشروب کا دور چلا پھر کھانا شروع ہو گیا کھانے کے دوران بھی میں اس ہسپانوی دوشیزہ کو پاکستان کے بارے میں بتاتا رہا پاکستان کے بارے میں ہی باتیں کرتا رہا اب میں سا کے حسن کے طلسم سے باہر نکل آیا تھا۔ غرناطہ کے آخری تاجدار نے اس ہسپانوی دوشیزہ کو توڑ دیا تھا۔

کھانا ختم ہوا تو باہر برآمدے میں آ کر بیٹھ گئے اور کافی کا دور شروع ہو گیا باہر لیموں اور سنگتروں کے پھولوں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی دونا نے گہرا سانس کھینچتے ہوئے پوچھا:

''سینور! کیا شام کے وقت تمہارے پاکستان میں بھی پھولوں کی خوشبو پھیلی ہوتی ہے؟''

میں نے کہا:

''ہمارے ملک میں ہر موسم میں پھولوں کی خوشبوئیں باغوں اور گھروں میں پھیلی ہوتی ہیں ہمارے ہاں گرمیوں میں موتیے اور گیندے اور سرخ گلاب کے پھولوں کے ہار بازاروں اور گلیوں میں فروخت ہوتے ہیں۔''

ہسپانوی دوشیزہ خاموشی سے میری باتیں سن رہی تھی آخر اس نے وہ سوال پوچھا جس کا میں انتظار کر رہا تھا اس نے پوچھا:

''سینور! پاپا کہتے ہیں کہ پاکستان بنیاد پرست مسلمانوں کا ملک ہے۔ یہ بات کہاں تک سچ ہے؟''

میرے اندر پھر وہی بگولا چکر لگانے لگا۔ مگر میں نے اپنے آپ کو بڑی جلدی سنبھال لیا

اور دونا فرانسسکا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''سینوریتا! پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم مسلمان ہیں ہم نے اسلام کے نام پر پاکستان بنایا ہے کیونکہ ہم اپنے دین کے اصولوں پر چل کر زندگی بسر کرنا چاہتے تھے دوسری بات یہ ہے کہ بنیا پرستی سے تمہارے پاپا کی مراد اگر تعصب ہے تو پھر تم لوگ ہم سے زیادہ بنیاد پرست ہو جس تصویر میں تم نے غرناطہ کے آخری مسلمان حکمران کو عیسائی بادشاہ کے سامنے ہتھیار ڈالتے دکھایا ہے وہ تمہاری بنیاد پرستی کی منہ بولتی تصویر ہے ہمارے مسلمان سپہ سالار سلطان صلاح الدین ایوبیؒ نے عیسائی سپہ سالار چرڈ کو یروشلم میں شکست دی تھی مگر ہمارے کسی مسلمان مصور نے اس کی تصویر نہیں بنائی نے اس کی تصویر نہیں بنائی۔ اگر اسلام کے اصولوں پر چل کر زندگی بسر کرنے کو تم لوگ بنیاد پرستی کہتے ہو تو پھر ہم سب مسلمان ضرور بنیاد پرست ہیں کیونکہ ہم مسلمان ہیں جس طرح تم لوگ کرسچین ہو اور عیسائی مذہب کے مطابق زندگی بسر کر رہی ہو۔''

دونا فرانسسکا اپنے صوفے سے اٹھ کر میرے صوفے پر میرے قریب آ کر بیٹھ گئی اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں لیتے ہوئے بڑی معذرت کے انداز میں کہا،

''سینور! مجھے معاف کر دو مجھ سے غلطی ہو گئی وہ تصویر میں نے محض اسے ایک تاریخی واقعہ سمجھ کر بنائی تھی اس سے کسی کی دل آزاری ہرگز مقصود نہیں تھی۔''

میں نے کہا:

''تاریخی واقعات تو ہمارے پاس بھی بہت ہیں سینوریتا مگر ہم نے ان کی تصویریں بنا کر کبھی تشہیر نہیں کی۔''

دونا فرانسسکا بڑی کشادہ ظرفی کا مظاہرہ کر رہی تھی مگر یہ سب اوپرا اوپر کی کشادہ ظرفی تھی اس کی حقیقت ظاہر ہو چکی تھی یہ وہ حقیقت تھی جو سپین کے ہر دوسرے غیر مسلم کے دل میں

مسلمانوں کے خلاف نفرت کے جذبے کے طور پر موجود تھی ۔ یہ نفرت دراصل ان کا احساس شکست تھا احساس ہزیمت تھا کیونکہ عربوں نے صدیوں تک ان کے ملک پر حکومت ہی نہیں کی تھی بلکہ نسل در نسل ان کی رگوں میں عرب مسلمانوں کے خون کو جاری وساری کر دیا تھا سقوط غرناطہ کے بعد وہاں کے عیسائی حکمرانوں اور پادریوں کے ایماء پر مسلمانوں کو چن چن کر شہید کیا گیا یہاں تک کہ ہسپانیہ میں ایک بھی مسلمان باقی نہ رہا۔ ہزاروں مسجدوں کو ڈھا دیا گیا جو شہید نہ کی جا سکیں انہیں گرجا گھروں میں تبدیل کر دیا گیا ہسپانیا کے عیسائیوں نے مسلمانوں کو اندلس کی سرزمین سے تو نکال دیا مگر ان کے خون کے اپنے رگ وپے میں سے نہ نکال سکے جو کل بھی ان کی رگوں میں جاری وساری تھا جو آج بھی جاری وساری ہے اور آنے والی نسلوں میں بھی جاری وساری رہے گا۔

دونا فرانسسکا میرے پاس بیٹھی میری دل جوئی کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا اس کے حس بلاخیز میں اب مجھے اپنی اہانت کی بجلیاں تڑپتی نظر آ رہی تھیں وہ حسن ہی کیا جس کے پیچھے تعصب اور ذہانت سے تہی دامنی کارفرما ہو حسن اپنی جگہ پر مگر عزت نفس اپنی جگہ پر.....وہ حسن وہ محبت انسان کی موت ہے جو آدمی کی عزت نفس کو ہلا کر دے۔

میں نے صوفے سے اٹھتے ہوئے دونا فرانسسکا سے اجازت چاہی وہ جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی.....!

''سینور! رات کافی گذر چکی ہے میں نے تمہارے بیڈروم میں بستر لگوا دیا ہے۔''

میں نے معذرت پیش کرتے ہوئے کہا،

''سینوریتا! تمہارا شکریہ لیکن اب میں جانا چاہتا ہوں میں تمہاری میزبانی کا ایک بار

پھر شکریہ ادا کرتا ہوں اگر تمہارا ڈورزائیور مجھے ڈاؤن ٹاؤن تک چھوڑ آئے تو میں مزید شکر گذار ہوں گا۔"

دونا نے کہا:

"ہمارا ڈرائیور آج کل یہاں پر نہیں ہے میں خود تمہیں چھوڑ آتی ہوں۔"

میں نے صاف لفظوں میں کہا،

"نہیں سینوریتا۔ میں نہیں چاہتا کہ تم مجھے چھوڑ کر آؤ مجھے ڈاؤن ٹاؤن جانے والی بس کہیں نہ کہیں سے مل جائے گی۔"

دونا فرانسسکا شرمسار ہو رہی تھی کہنے لگی،

"اگر تم میرے ساتھ نہیں جانا چاہتے تو میرا ملازم تمہیں چھوڑ آئے گا وہ ڈرائیونگ جانتا ہے۔"

تھوڑی دیر بعد ہم بنگلے کے پورچ میں کھڑے تھے دونا کا ملازم گاڑی نکال کر لے آیا۔ میں گاڑی میں بیٹھنے لگا تو دونا فرانسسکا برآمدے کی سیڑھیوں میں کھڑی میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلانے لگی۔ میں نے بالکل ہاتھ نہ ہلایا۔ میں منافقت نہیں کر سکتا تھا۔ گاڑی بنگلے سے نکل کر قرطبہ کے مضافاتی علاقے میں داخل ہوگئی۔

میں دونا فرانسسکا کی گاڑی میں بیٹھتے ہوئے ایک بے چینی سی محسوس کر رہا تھا۔ سڑک پر مجھے ایک بس سٹاپ نظر آیا تو میں وہاں اتر گیا اور گاڑی واپس بھیج دی بس سٹینڈ پر ایک عورت کھڑی تھی میں نے اس سے پوچھا کہ مسجد قرطبہ کو یہاں سے کونسی بس جاتی ہے اس نے بھنویں چڑھا کر میری طرف دیکھا اور بس کا نمبر بتا کر منہ دوسری طرف کر لیا۔ میں ایک طرف کھڑے ہو کر بس کا انتظار کرنے لگا کافی دیر بعد اس نمبر کی بس آئی تو میں اس میں سوار ہو گیا بس ماڈرن

قرطبہ کے روشن علاقوں میں سے گذرتی ہوئی اولڈ قرطبہ کے علاقے میں داخل ہوئی تو دور سے مجھے مسجد قرطبہ کے پہلو میں بہتے ہوئے دریائے دادالکبیر کے پل کی روشنیاں نظر آنے لگیں۔ بس اولڈ قرطبہ کے اونچے نیچے بازاروں میں سے ہوتی ہوئی مسجد قرطبہ کے سٹینڈ پر ٹھہر گئی۔

اس وقت مسجد قرطبہ کا صدر دروازہ اور دالان کا محرابی دروازہ دونوں بند تھے مسجد قرطبہ اپنے پورے جاہ وجلال کے ساتھ ستاروں بھرے آسمان کے پس منظر میں میری آنکھوں کے سامنے تھی۔ میرا دل شدت احترام کے ساتھ لرز رہا تھا میں سر جھکائے آہستہ آہستہ چلتا مسجد قرطبہ کے پہلو میں آ گیا جہاں زیتون کی گھنی جھاڑیاں اندھیرے میں سایوں کی طرح نظر آ رہی تھیں ان کے پیچھے کھجور کے درخ تھے۔ میرا رخ خانہ کعبہ کی طرف تھا اس کے بعد مجھ پر رقت کیفیت طاری ہوگئی اور میں وہیں سجدے میں گر گیا۔ مجھے کچھ یاد نہیں میں کہ کتنی دیر خدائے ذوالجلال کے حضور سجدہ ریز رہا کچھ یاد نہیں سجدے میں میں نے کیا پڑھا کیا نہیں پڑھا اتنا یاد ہے جب میں سجدے سے اٹھا تو میری آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی میں کونسا پختہ مسلمان تھا میری کیا حیثیت تھی۔ میں تو مسجد قرطبہ کی خاک کے ذروں کے برابر بھی نہیں تھا مگر جب میں سجدہ ریز تھا تو میرے آنسو مسجد قرطبہ کی سرزمین میں جذب ہو رہے تھے میرے لیے یہی اعزاز بہت تھا خدا کی طرف سے عطا کی گئی بہت بڑی توفیق تھی۔ میں آنکھوں میں آنسو لیے مسجد قرطبہ سے واپس چلا کہاں سے بس پکڑی کیسے ہوزے فریئر کے فلیٹ پر پہنچا کچھ یاد نہیں کچھ یاد ہے تو صرف اتنا یاد ہے کہ اسی روز میں قرطبہ شہر سے جدا ہو رہا تھا جب میری بس دریائے دادالکبیر کے پل کے قریب سے گذری تو میری آنکھیں اپنے آپ مسجد قرطبہ کے میناروں کی طرف اٹھ گئیں۔ میری آنکھوں میں آنسو تھے اور زبان پر اقبالؒ کے یہ اشعار تھے۔!

ہسپانیہ! تو خون مسلماں کا امیں ہے
مانند حرم پاک ہے تو میری نظر میں
پوشیدہ تیری خاک میں سجدوں کے نشاں ہیں
خاموش اذانیں ہیں تیری باد سحر میں